مقدمۃ القرآن

An Approach to The Quran

[illegible]

مقدمۃ قرآن

پروفیسر احمد رفیق اختر

سنگ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

اللہ
بزرگ و برتر کے نام جس نے عقل تخلیق فرمائی
اور اسے حُسنِ منتخب قرار دیا' امانتِ علم و شعور
بخشی اور قدرِ انسان کا باعث فرمایا۔ اس توفیق
کے نام جو اُس نے مجھے بخشی اور اُسی سے
قبولیتِ کاوش کی آرزو ہے۔

ابتدائیہ

یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ نسلِ انسانی کی معلومہ تاریخ کا کوئی دور اللہ کے نفوسِ مقدسہ سے خالی نہیں رہا۔ پروردگار نے انہیں حقیقی علم سے روشناس کرایا۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے پروردگار کی دعوتِ تفکر کو ترجیحِ اول کی حیثیت دی اور خبر و نظر کے اصل روحانی سرچشموں سے سیراب ہو کر مخلوقِ خدا کے لیے خالق کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کو روشن سے روشن تر کر دیا۔ دورِ حاضر کی ایسی ہی لائق صد احترام ہستیوں میں ایک پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی ذاتِ گرامی بھی ہے۔

اب تک پروفیسر موصوف کی چند کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جو ان کی ریکارڈ کردہ گفتگوؤں پر مشتمل ہیں۔ زیرِ نظر کتاب یعنی ''مقدمۃ القرآن'' ان کی پہلی تصنیف ہے، جو ان کی اپنی تحریر کردہ ہے۔ یوں تو پروفیسر صاحب کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ان کی مخصوص طرزِ فکر اور حیات آفریں تعلیمات کی ترجمان ہے، لیکن اس کا اہم ترین پہلو یہ

ہے کہ انہوں نے نائن/ الیون کے بعد کی عالمی صورتِ حال کے تناظر میں مسلمانوں کو ایک ایسی راہ سُجھائی ہے جس پر اگر وہ ثابت قدمی اور حوصلہ مندی سے گامزن رہے، تو مایوسی اور بے یقینی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کو اس بات کا پختہ یقین دلاتی ہے کہ اگر ہم نے اللہ کی رسّی یعنی قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور اس کی دعوتِ فکر و عمل کو اپنی اولیں ترجیح کی حیثیت دی، تو پھر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ مختصراً یہ کتاب نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے ایک پیغام بھی ہے اور درخشاں مستقبل کی نوید بھی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ مذہب عادت ہے یا انتخاب۔ بے شمار لوگ مذہبی ہیں۔ وہ بھی جو لامذہب ہیں، کسی نہ کسی معقول و غیر معقول پر اعتبار رکھتے ہیں۔ ارنسٹ ہمینگوے (Ernest Hemmingway) بھی ہاتھ کے کڑے پر یقین رکھتا تھا۔ اعتبار کرنا انسان کی عادت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اعتبار انسان کی ابتدائی تنہائی کا نتیجہ ہے۔ چھ ارب انسانوں میں بھی فرد تنہا ہو سکتا ہے اور جب کوئی نہ تھا تو انسان کا اعتبار کتنا ترس رہا ہوگا۔ ذہنِ انسان کی ابتدائی تقسیم یقین اور بے یقینی کی تھی۔ بے یقینی ایک خود غرض جبلت کا فطری انجام ہے۔ اخلاص، محبت اور ایثار کم سے کم جبلی دور کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ عقل، دور اندیشی، تعمیرِ مستقبل سریع العمل جبلت میں وجود پذیر نہیں ہو سکتے۔ بہت سے لوگ جو کسی الہیاتی وجود پر یقین رکھتے ہیں، کسی حقیقی دلیل کے لیے سسکتے نظر آتے ہیں۔ ان کے دلائل جبلی آسیب کے سائے لگتے ہیں۔ کیا آسیب جزوِ ذہن اور مذہب سے بڑی سچائی نہیں ہے؟

کیا طویل عرصہ تک عرصہ دہر میں رہنے والا انسان متفقہ طور پر عقلی سیادت کو تسلیم

کر چکا ہے۔ کیا مذہب انسانوں میں اجتماعی اور اخلاقی شعور پیدا کرنے کے قابل ہوا اور کیا نسلِ انسان نے مذہب کی شکل میں ایک مفروضہ جنت کے تصور کو متشکل کر لیا ہے؟

ہر جگہ مذہب کی وحدانیت تقسیم شدہ نظر آتی ہے۔ مکمل انضباط اور صورتِ امن کی بجائے مذہب ایک تقسیم کار طاقت نظر آتا ہے‘ جو عام جبلی تعصبات سے بالاتر زیادہ مؤثر اور ہلاکت خیز صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

کیا مذہب ہی مقصودِ انسان ہے؟ اور اگر مذہب کی کوئی وحدانی قوتِ تخلیق موجود ہو تو اس کا مقصد یہی تقسیم و تعصب ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مذہب کی بجائے کسی جبلت کے پردہ پوش فنٹم (Phantom) کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ مرغوب اور مؤثر فریب نے ہمیں عقل کی کسی ایسی پگڈنڈی پر ڈال دیا جو Diversion کا شکار ہے اور کبھی بھی شاہراہِ یقین تک نہیں پہنچ سکتی۔

مذہب اب ایک ایسی ترغیب نظر آتا ہے جو کارل مارکس کو Have-nots کے ہلاکت زدہ چہروں کی وحشت کا ہم رنگ ہے۔ مذہب ایسے ردِعمل کی طرح ہے جو ہیروئن (Heroin) کی Addiction کی طرح سوچ سمجھ کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہوا وہ تمام خصائص اُجاگر کر رہا ہے، جو انسان کے ابتدائی دورِ بقا میں موجود تھے۔ کم از کم یہ مذہب کسی علیم و حکیم ربِ کائنات کی لوحِ محفوظ میں درج نہیں ہو سکتا۔ مذہب میرے جنون کی ایک سمت ہے۔ میری محرومیوں کا ردِعمل ہے اور میرے ہی اندازِ فکر کے مطابق میرا ہی پیش کردہ

حل ہے۔ اس میں کسی خارجی اعلیٰ ترین تخلیقی وجود کا کوئی پیرایۂ اخلاق نظر نہیں آتا۔ مذہب کا انکار کرنے والی تمام قوتیں اسی مذہب کے وجود سے انکار کرتی ہیں اور دنیا کو اپنے بنائے ہوئے ضابطۂ اخلاق سے سنوارنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ متغیر اور متبادل حل جو مفکرینِ لادینیت پیش کر سکے ہیں، نہ تو متفقہ ہے اور نہ ہی پائدار۔ یہ انسان کی اعصابی تھکن کا نتیجہ ہے کہ وہ کم بدتر کا انتخاب کر رہا ہے۔ یہ نظام بظاہر انسان کی حمایت کرتا نظر آتا ہے، مگر اس کی عملی صورت کا تفاوت اتنا بڑھ گیا کہ اگر یہ نظام اپنی فطری عمر پوری کر سکا تو موجودہ انسانی تمدن کو موہنجوداڑو، ہڑپہ، پومپائی (Pompeii) اور عاد و ثمود کے کھنڈرات میں بدل دے گا۔ شترمرغ ریت میں سر چھپا کے وحشت اور ہلاکت کے مارے ہوئے خون آشام بھیڑیوں کی چیرہ دستیوں سے نہیں بچ سکتا۔

یہ کہنا اب بھی مشکل ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہیں، مہذب ہیں اور ہمارا مستقبل روشن ہے۔ ہجوم انسانوں سے خالی نظر آتے ہیں۔ اعلیٰ ترین درسگاہیں عقل و معرفت کی نوحہ گر ہیں۔ دانشور عہدِ قدیم کے وہ ساکت و صامت بُت ہیں جن کو اپنی پرستش کے سوا کچھ اور غرض نہیں۔ عقلی تصرفات اعداد و شمار اور اشیاء کے غلبے کے اسیر ہیں۔ ابنائے تعلیم نے مشرق و مغرب میں تازہ بُت تخلیق کر لئے ہیں۔ درسگاہوں کی شکل میں اور اساتذۂ تحقیق کی شکل میں۔ پیچ در پیچ علم ایسی پگڈنڈیوں پر گامزن ہے کہ راہِ عقل اب کسی اداس مسافر کے پاؤں کی چاپ سے بھی محروم ہو چکی ہے۔

مذہب اور لامذہب ایسے ہمسائے ہیں کہ جو رہتے تو اکٹھے ہیں مگر ایک دوسرے

کی املاک پر قبضۂ غاصبانہ کے حریص ہیں۔ انسانی فکر کی بے راہ روی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ کیا گناہ، ثواب، جزا اور سزا کا بحران درپیش ہے؟ کیا انسان کسی جابرانہ نظام کے تسلط کے خلاف اپنی احمقانہ جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم رکھے ہوئے ہیں؟ کیا ایک ناپائدار دنیا میں ناپائدار زندگی کے تصور نے اس کے حواس سلب کر لئے ہیں؟ اور کیا یہ تمام انحراف عمرِ مختصر کا گلہ ہے؟ مہیب اور بے حس کائنات میں اپنے وجود کی تحقیر اور بے بسی کا ردِ عمل ہے۔ دامنِ انسان وساوس سے تار تار رہے اور اُمید۔۔۔۔۔۔ لامحدود کائنات میں بے نام ونشان سیارچے کی طرح منتشر، بے بس، بے منزل، بے حقیقت۔۔۔۔ صنعتِ فریب ترقی پذیر ہے۔ سراب درسراب جہالت عقل ودانش کے لباس میں فروغ پذیر ہیں۔ سرابِ چشم میں بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ سکائی سکریپرز، اسکیلیٹرز، حیران کن کمپیوٹرز، برق رفتار فضاؤں سے گذرتے ہوئے مسافرت کے آلات، میزائل، شٹل، مریخ اور زحل کا نوآبادیاتی تصور، عمر دراز کے جینیاتی خواب، امراض پر تصرف، ہیپاٹائٹس، کینسر اور ایڈز پر غلبہ پانے والی ادویات، دست و پا کی اذیتوں کو کم کرنے والی مشینیں، کوانٹم اور اضافیت کی تحقیقات، نت نئے معاشی نظریات، تفسیرِ کائنات کی توجیہات اور تسخیر کائنات کے عزائم، بہت کچھ تو نظر آ رہا ہے۔ ترقی اور استعداد میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

ہاں مگر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اپنے اپنے عصر میں اپنے اپنے معیار کے مطابق پہلے بھی اقوامِ دنیا نے ترقی اور تنزل کے مدارج طے کیے ہیں۔ اگر ان اقوام نے فی الواقع ترقی اور عزت کے مناصب حاصل کیے تو وہ نیست و نابود کیوں ہو گئیں۔ تاریخ توارو ہے، تسلسل ہے۔ انسان کی ملائکہ پر بنیادی برتری ہی یہی تھی کہ ماضی کے اسباق کو زندہ رکھتا ہے اور اس میں غلطی اور حماقت کے اقدام دور کر کے اُسے حال میں بہتری کے لیے استعمال کرتا ہے اور مستقبل کے اشارات چھوڑ دیتا ہے۔ مگر تاریخ وہ واحد بدقسمت درس بھی ہے، جس نے کبھی بھی کسی آمر اور جاہ پرست کو ہدایت نہیں بخشی۔ ہر آمرِ مطلق نے تاریخ کو طاقِ نسیاں پر رکھا اور اپنے آپ ہی کو تاریخ ساز سمجھا۔ اس نے کسی گذرے ہوئے واقعہ سے ہدایت طلب نہیں کی۔ کتنی ہی مرتبہ خدائے واحد کی پرستش بتوں کی یلغار کی نذر ہوئی۔ کتنے ہی فاتحین انہی حماقتوں کا شکار ہوئے جو ان سے پہلوں سے سرزد ہوئیں۔ یونان کے فلسفی اور ایتھنز کے جمہوری انداز بھلا دیئے گئے۔ روما کے دیوتاؤں کو سسرو (Cicero) اور پلوٹارک بھی نہ بچا سکے۔ تاریخ انضباطِ نفس میں ناکام ہو گئی۔ تاریخ دلچسپ ہے۔ کھنڈروں

اور ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے معاشی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تاریخ کو مکمل سچائی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ واقعات پر رائے زنی کرنے والے بہت بعد میں آتے ہیں۔ درسِ عبرت سیکھنے والے تو کبھی بھی نہیں آتے۔ میدانِ جنگ میں لڑنا اور درس گاہوں کی آرام دہ کرسیوں پر گفتگوئے جنگ کرنا بہت بڑا فاصلہ ہے۔

فاسلز (Fossils) حیاتِ انسانی کی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور تاریخ قوموں اور افراد کے کارنامے ماضی کے اندھیروں میں دور دراز کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرح روشن رکھتی ہے۔ زمین اور آسمان کے فاصلے شاید رات کو چمکتے ستاروں سے کم نظر آتے ہیں۔ بھولے ہوئے اسباق کبھی ایک لفظ اور فقرے کے یاد آنے سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ فاصلوں کا احساس کسی سنگِ منزل سے کم ہو جاتا ہے۔ مگر تاریخ تو حقائق کی داستان نہیں رہی۔ آج کی حماقتیں ہمیں ماضی کی خطاؤں کی تماثیل نظر آتی ہیں۔ زوال سے پہلے کوئی تأسف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ زوال ہی فلسفۂ وجود ہے۔ بہت سے دانشور ایسے ہیں جنہیں حسینؓ اور یزید دونوں مظلوم نظر آتے ہیں۔ پیغمبرانِ قدس کے کچھ ناقد ایسے بھی ہیں جنہیں انسانوں کی گلیکسی کے یہ روشن آفتاب بھی آمریت کے طلب گار نظر آتے ہیں۔

کیا یہی ان کی عقل ہے جو ترقی پذیر ہے؟ حضرت انسان ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ کیوں کرنا ہے اور کس لیے کرنا ہے۔ آثار قدیمہ (Antiquities) سے ڈرائنگ روم کی زینت کا کام تو لیا جاتا ہے مگر درسِ عبرت کی تحصیل فرسودگی کی علامت ہے۔ مہاتما بدھ نے اس خوف سے خدا کا نام نہ لیا کہ اس کا دیا نام بھی

برہمن کے بت کدے میں ایک پتھر کا اضافہ نہ کر جائے مگر تاریخ سے عبرت حاصل کرنے والے اشوک نے اسے ہی پتھر بنادیا اور درسگاہوں میں مہاتما بدھ کی تعلیم کی بجائے مجکوم بت تراشوں کے کام کی تفصیلات یاد رکھنے کی رسم پڑ گئی۔

کیا تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اقوامِ عالم غربت میں نہیں تباہ ہوئیں۔ یہ عجیب بات نہیں کہ ہر قوم اپنی ترقی، عظمت اور معیشت کی کثرت کے وقت انجانے حادثوں کا شکار ہوگئی۔ تاریخ نے حقائق تو پرکھے مگر کسی تاریخ نے یہ نہیں لکھا کہ ایک قوم اپنے تمرّد اور سرکشی کی وجہ سے برباد ہوئی۔ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ عادِ اولیٰ اور ثانیہ اپنے غیر انسانی اور بد اخلاقی رویوں کی وجہ سے تباہ ہوئی، مگر یہ لکھا ہوا بھی ہو تو آج کی مہذب قوموں نے اس تاریخی سبق کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کیا انہوں نے واضح غیر اخلاقی رویوں کو قانونی تحفظ نہیں دیئے؟ کیا عقل پرستوں نے جبلتوں کی تخریب کی راہ ہموار نہیں کی؟ مستقبل کا مؤرخ یہ لکھنے کے قابل ہو جائے گا کہ حضرت انسان نے اس تاریخ سے ان فاش حماقتوں سے گریز کرتے ہوئے بہتر اور برتر انسانی معاشرے کے لیے کوشش نہیں کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نسلِ انسان کبھی متفق نہیں ہوئی، متحد نہیں ہوئی۔ ان میں اقدار کی ہم آہنگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں نے عقل نہیں سیکھی۔ انہوں نے زمین بانٹی، آسمان بانٹا، جسم تقسیم کیے، خون تقسیم ہوا، اقتدار و تصرف کی جنگ لڑی، زمان و مکاں پر اپنے تصرف کے دعوے کیے اور تیزی سے اپنے انجام کو روانہ ہونے کی کوشش کی۔ اور یہ انجام تاریخ کی پہلی اقوام سے جدا نہیں ہے۔

میں اس زمانے کا ہوں مگر بغیر کسی تردد کے یہ رائے دے سکتا ہوں کہ تاریخ یہ

بتاتی ہے کہ آج کا انسان زود یا بدیر کسی طوفان نوح کا' کسی قیامت کبریٰ کی مکمل ہلاکت کا شکار ہونے والا ہے۔ تمام تاریخ گواہ ہے کہ تمام عقلی شہادتیں اسی طرف رواں ہیں۔ یہ پیشین گوئی نہیں۔ تاریخی حقیقت ہے اور اس میں صرف زمانے کی کچھ ساعتیں حائل ہیں۔ یہ قنوطیت نہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے' جو معجزات کے تصور سے گریز کیا کرتی ہے۔ یہ غیر حقیقی اور روحانی تصور نہیں کہ اب کی مرتبہ تاریخ اپنی تاریخ نہیں دہرائے گی۔ آپ کس معجزے کی تلاش میں ہیں اور کس سے یہ معجزہ طلب کر رہے ہیں۔ ریاضی، فزکس، جیومیٹری اور کمپیوٹر سے ہدایت پانے والے تو حقیقت پسند نہیں ہوتے۔ کتنے ہی سائنسی حقائق پرانے افسانے بن چکے ہیں اور کتنے ہی جدید سائنسی تصورات ابہام کا شکار ہیں اور کتنے ہی آخری سائنسی نتائج دوبارہ آغاز تک جا چکے ہیں۔

تاریخ بھی تو سائنس ہے' جو تسلسل سے زمان و مکاں میں اپنے نتائج کو دہراتی چلی آرہی ہے' نہ واقعات میں انحراف ہے نہ عادات میں۔ وہی واقعات تو ہیں جو بار بار اس انجام کو بڑھتے ہیں۔ کیا آپ کو تاریخ میں یہ فارمولا نظر نہیں آتا کہ اگر باقی معاملات وہی رہیں جیسے پہلے تھے تو نتائج وہی نکلیں گے' جو پہلے تھے۔ یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ رجعت پسند کون ہے۔ اگر عقل آگے بڑھنے کا راستہ ہے تو جہلت پیچھے پلٹنے کو زندگی سمجھتی ہے' مگر کیا یہ طرزِ عمل اشیاء میں نمایاں ہوتا ہے یا توجیہات میں۔ کار، ریل یا جہاز میں گھر سے جانے اور آنے کو تو رجعت پسندی نہیں کہتے۔ کیا قدامت کو پلٹنا رجعت ہے۔ آج کونسا ابنِ آدم ہے جو بس کی بجائے گدھے پر 100 میل کا سفر کرتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں تو کوئی رجعت پسند نظر نہیں آیا۔ شاید آپ تعصبات کی تجدید کو رجعت پسندی کہتے ہیں۔ کوئی واپس تصورِ خدا کو جاتا ہے اور

کوئی سپارٹا (Sparta) اور لیشوس (Leshos) کی عادات کو پلٹتا ہے۔ مشرق کی رجعت کی عمر کم زمانی ہے اور اہلِ یورپ کی رجعت تو عاد و ثمود کی ہے۔

Primates تو واضح طور پر تجسس اور خیال کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور ہم دورِ حاضر کے لوگ Zeus دور کے Satyr اور Nymph بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ آلات ترقی کی علامات ہیں۔ وہ آلات جو اپنے وجود کو متحرک کرنے کے لیے آپ کی جنبشِ انگشت کے محتاج ہیں۔ اگر آلات ہی ترقی ہیں تو ابراہیمؑ کی بات میں کتنی سچائی ہے۔ بڑا بت ہی چھوٹوں کا قاتل ہوگا۔

انسان آزادی کے نام پر کس منزل کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ کچھ ذاتی آزادیوں کے نتائج کچھ معاشروں میں نمایاں ہیں۔ کچھ ان آزادیوں سے اجتناب کر رہے ہیں جو شاید رجعت پسند ہیں۔ سوچو کہ یہ اجتنابی رجعت پسند نہ ہوں تو آزادیوں کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ لات و منات اور ہبل تو اب بھی موجود ہیں۔ کعبہ کے گرد ننگے طواف جہالت ہیں تو ریاستی فحاشی اور Striptease کیسے عالمانہ فضائل سمجھے جاسکتے ہیں۔

ہبل نہ سہی، Statue of Liberty سہی۔ کواکب جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہی لگتے ہیں۔ بہت سے کلیشے (cliches) دورِ حاضر کے آداب میں شامل ہیں۔ یہ طنزیہ گفتگو کا حصہ ہیں۔ سنا ان سے Dogma ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ دقیانوسی ہو، غیر متمدن ہو، رجعت پسند ہو، عصرِ جدید کے قابل نہیں ہو۔ بے سود مذہب کے پیروکار رہو۔ ذہانت کی پسماندگی کا

شکار ہو۔ اچھی طرح پالش نہیں ہوئے، تمہارا حجاب ظاہری دراصل تمہاری عقل پر پڑا ہوا ہے۔ تھوڑا گریباں کھلا ہو تو ہوا اچھی لگتی ہے۔ نگۂ بے باک اور زلفوں کے لہراؤ نمایاں نہ ہوں تو تمہارا وجود تمہارے لیے طنز بن جائے گا۔ تمہاری Language سے تمہارا اشرف ٹپکتا ہے۔ کوؤں کو ہمیشہ ہنس کی چال چلنی چاہیے۔ تمہاری زبان مرصع اور شائستہ ہے۔ مگر اس زبان کا کوئی بین الاقوامی وقار نہیں۔ بول چال کے لیے زبان، غیر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور بو زبانی اشارات تمدن و ترقی کی علامت ہیں۔ تم اچھے انسان ہو سکتے ہو مگر جدید نہیں۔ عام دریاؤں کے سفید چمکتے ہوئے پانی سمندر کے کھارے بدہیئت اور ظلمات رنگ پانی میں مل جاتے ہیں۔ تجدد سمندر کی طرح ہے لہر در لہر تاریک تہہ سمندر سے سطح سمندر تک تاریکیوں کی مسلسل جدوجہد جن کو رحم و کرم کے برستے ہوئے بادلوں کا صاف مقطر اور حیات افزا روشن (شفاف) پانی بھی صاف نہیں کر سکتا۔ امیر خسروؒ نے کہا تھا پانی سڑا کیوں، گھوڑا اڑا کیوں۔ جواب ہے موڑا نہ گیا۔ ہزارہا سال کی پیغمبرانہ کوشش بھی گلتی سڑتی انسانی ذہانت کا رُخ نہیں موڑ سکتی۔ جدید انسان کے معیارِ انصاف کا یہ عالم ہے کہ پریمیٹ (Primate) کے کیپوچن (Capuchin) بندر کا معیار بھی بش اور بلیئر کی قدرِ انصاف سے بہتر نظر آتا ہے۔

ایک بہت بڑا سوال جو مجھے ہمیشہ درپیش رہا‘ وہ یہ ہے کہ میں عقل کسے کہوں‘ عقلمند کسے کہوں، علم کسے کہوں، عالم کسے کہوں۔

سقراط سے رسل (Russell) تک یا شاید دورِ حاضر کے علوم وفنون کے حرفِ آخر تک مجھے بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے جعل سازی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کو بنیادی ترجیحاتِ ذہن سے منحرف اور گمراہ کیا ہے۔ ذہنِ انسان کے یہ کم تر درجہ کے لوگ تھے جنہوں نے مل جل کے انسان کی عمومی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور ثانوی درجہ کی ترجیحات مرتب کیں اور ایک دوسرے کو داد و تحسین دیتے رہے اور طاغوتی فکر کو انسان کی ترقی قرار دیا۔ چلئے پہلے ایک معمول کا سوال دیکھتے ہیں۔ زمانۂ غار کے کم علم اور کم عقل انسان کے پاس زندگی گذارنے کے اسباب کم اور خطرات زیادہ تھے۔ وہ ایک Genius یا نابغہ کی طرح تھا جو اس ابتدائے زندگی کے خطرات کی اولیں توجیہ (Virgin Perception) کر رہا تھا۔ اس کے پاس تو معمول کے ذرائع بھی نہیں مگر

اس کم فہم اور کم عقل انسان نے اپنی ترجیحات کو صحیح سمجھا اور انسان کو اور امانتِ زندگی کو آپ تک پہنچا دیا۔ شجرِ حیات اپنے خون سے سینچے ہوئے شعور کے حصول کے لیے بے انداز تکالیف سے گذرا۔ آئندہ نسلوں کو محفوظ ماحول پہنچانے کی کوشش کرتا رہا، زندگی کی حفاظت، ابلاغ کی نعمت، تجربات کا اجراء اور معاشرے کی ترتیب یہ اس کے بڑے تحائف ہیں جو اُس نے اگلے لوگوں تک پہنچائے۔ ہزارہا سال کے بعد ترقی یافتہ اور متمدن معاشرے کے فقہائے عقل و دانش اور محافظانِ حیات کی کارکردگی آپ کے سامنے ہے۔ عقل و دانش' توقیرِ ذات' ایجادات وجہ تحقیر و تسخیرِ انسان اور محافظت غارتگری میں بدل گئی ہے۔ آج کا ترقی یافتہ انسان اُس غیر متمدن' غیر ترقی یافتہ اور سادہ انسان پر کس فوقیت کا دعویٰ دار ہے۔ وہ پرانی جبلی اقدار کے خلاف جہاد کرتا ہوا عقل کا ذرہ ذرہ جمع کر رہا تھا اور یہ علوم و فنون، ایجاد و اختراع کے خزائن پر ناز کرتے ہوئے انہی بنیادی جبلتوں کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قصور اُس طویل فہرستِ علماء کا ہے جنہوں نے جان بوجھ کر نسلِ انسان کو دھوکا دیا۔ بنیادی ترجیح سے انحراف کرتے ہوئے انسان کو دلکش مگر بے سود اور مکروہ توجیحات میں اُلجھا دیا۔ فلسفی، دانشور، سیاست دان اور فاتحین ذاتی تفاخرات اور وجاہت طلبی کا شکار ہوگئے۔ کیا یہ اُن پیغمبرانِ قدس سے اظہارِ تنافر تھا۔ کون عقلمند تھا۔ وہ جو نسلِ انسان کو بنیادی ترجیح کی طرف بلاتے رہے یا وہ گروہِ نفاقِ عقل کہ انسانوں کو کمتر ترجیحات کے پیچ و خم کا شکار کرتے رہے۔ مذہب ہو نہ ہو، تھا کہ نہیں تھا۔ سوال تو بنیادی تھا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے اُسے کیوں حل نہیں کیا۔ فشٹے اور نیٹشے نے کیوں نہیں طے کیا۔ وٹ گن سٹائن (Wittgenstein) اور رسل کی تحقیق میں کیوں نہیں آیا۔ شاید ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ یہ اذہان اُس درجہ کے

نہیں تھے کہ زندگی کے فلسفہ کی ترجیحات ترتیب دے سکتے۔ یہ وہ کم درجہ عقل تھی جو حقیقت اور معاشرت کے دائرہ کار سے آگے نہیں بڑھی۔ جنہوں نے اپنی سوچوں کو تفاخر اور وجاہت کے ذرائع سمجھا۔ یہ اپنے ہی حسن عقل کے پجاری تھے۔ اُس کاسمولوجسٹ (Cosmologist) کو دیکھئے جو ابتدائے کائنات پر غور کر رہا ہے اور بنیادی انسانی سوال سے گریز کر رہا ہے۔ آئن سٹائن اضافتِ کائنات میں الجھا ہوا ہے، مگر اپنی موجودگی زمین اور تخلیق کا بنیادی اصول فراموش کر بیٹھا۔ یقین جانئے، میں طویل زمانی اور مکانی خود فراموشی کا کوئی جواز نہیں مرتب کر سکا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انسانی ذہانتوں کے یہ بڑے نام مجھے فریبِ فکر کے تارِ عنکبوت میں الجھے نظر آتے ہیں۔ ان سب نے مل کر جملہ نسلِ انسان کو دھوکا دیا، یا شاید یہ فریب خوردہ انسان اس بات پر مُصر تھے کہ ہم نسلِ انسان کی فکری استعداد کو محدود کر کے ذمہ دارانہ عقل و احساس تک نہ پہنچنے دیں، جو اِن کی محدود اور منافقانہ عقل کے پول کھول دے۔ یہ وہ کم فہم اور کم عقل لوگوں کی قطار ہے جو بنیادی خطائے انسان کو شرف عقل و معرفت بنا کر اپنے ہم جنس انسانوں کو یہاں تک لے آئی ہے کہ انسان ناشناخت ہے، منزل گم کردہ اور عاقبت معدوم۔

میں زندگی میں کبھی شکی اور بدمزاج نہیں رہا۔ چند لمحے تو پھر انسان کی پسماندگی کی نذر ہو ہی جاتے ہیں، نہ یہ کہ میں کسی انسان کے شرف کا حاسد رہا۔ انسانی ترقی کے ایک ایک قدم سے میرے اندر بھی برتری کے احساس نے جنم لیا مگر یہ سوال جس کا میں ابتدائے حیات میں شکار ہوا میرا نہیں تھا۔ یہ تو وہ سوال ہے جس کے بغیر کوئی بھی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ اُس پرچہ سوال کا کیا صِلہ ہوگا جس کے سارے جواب ہی غیر متعلقہ ہوں۔

عمرِ مختصر کی ابتداء اور انتہا اور جو کچھ اس کے درمیان واقع ہوتا ہے، بڑی آسانی سے کچھ اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی زندگی کسی نرالے، انوکھے اور غیر معمولی انداز حیات میں نہیں گذرتی۔ جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف اور جدا سمجھتے ہیں، وہ بھی ایک قسم میں سما جاتے ہیں۔ شہوات بدن بھی ایک جیسی ہیں اور شہوات خیال بھی۔ غور سے دیکھا جائے تو منفی اور مثبت ردعمل بھی ایک جیسا ہے۔

کیا مناسب ہے کہ ہندوانہ تقسیم رائج کی جائے۔ برہمن، پجاری آشرم، گرستھ آشرم، گربھ آشرم اور پھر تلاش حقائق کا آخری آشرم یعنی رشی منی آشرم۔ کیا یہی حال تمام دنیا کا نہیں کہ بنیادی اور اہم ترین حقیقت کے لیے ہم اس عمر کا انتخاب کریں جس تک پہنچنا بھی غیر یقینی ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص دانائی کا دعوے دار ہو سکتا ہے جو تمام عمر کی ترجیح اول کو عمر آخر کے اس حصے میں حل کرنے کی کوشش کرے جب حواس خمسہ زوال پذیر اور عقل ارذل ہو چکی ہو۔

کیا نسل انسان کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ کس حیثیت سے زندگی گذارنے آیا ہے۔ ایک بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ موجودہ انسانی فکر خود ستائشی کا شکار ہے۔ شاید اپنے آپ کو اس بے کراں وسعت میں ہم اکیلا پا رہے ہیں، جس کی سرِ دست ہم کو کوئی مضبوط شہادت نصیب نہیں ہے۔ خود پسندی کا عالم یہ ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔

ابھی ہم کائناتی معلومات کی دہلیز پر ہیں اور گمان یہ ہے کہ ہم وارثِ کائنات ہیں۔ ابھی ہم زمین و آسمان کی مخلوقات کے علم سے بھی بے بہرہ ہیں۔ لادینیت کے بے بصر عالم بغیر شہادتِ حقائق کے غیر طبعی اور غیر حقیقی اور ماورائی زندگی کے قائل نہیں مگر انکار صرف اس بات پر قائم ہے کہ شہادتِ نظری اور شہادتِ بصری موجود نہیں۔ کیا ذہن کے تمام خدشات، وساوس اور تخیلات نظری اور بصری شہادت ہی پر قائم ہوتے ہیں۔ ایسے ہوتا تو شاید ادیب کبھی ایک نیا جملہ نہ لکھ پاتے اور شاعر کلام میں کوئی اُپج نہ تخلیق کر پاتا۔ سائنس دان جو صرف اشیاء کے تعلق کا طالب علم ہے، اشیاء کی حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ چند اعداد و شمار کو شائی لاک کی طرح سمیٹے ہوئے تمام ماورائے اعداد علوم کو مفروضہ سمجھ کر فارغ کر دیتا ہے۔ وہ اتنا مجبور ہے کہ بہترین انسانی اوصاف، تخلیقی رویے اور خیالات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ اس کا انکار اس کی عقلی تنافر بن چکا ہے اور عظمت کے شزوفرینیا (Schizophrenia) کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے معمولاتِ زندگی پر آخری سند سمجھا جائے۔

یعنی فلاسفہ کہتے ہیں عقل سے شہادت ملنی چاہیۓ
مگر ، انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا نظر نہیں آتا۔ بھلا
نظر کی شہادت کو عقل کا حصہ مانا جاتا ہے؟

مگر بہت سارے سائنسدان ایسے ہیں کہ جن کی ذہانتوں کے بنیادی معیار متناسب سے کم تر ہیں۔ بہت سارے زندگی کے مسائل میں اُن کی اپروچ غیر حقیقی، غیر عملی اور بعض اوقات احمقانہ ہے۔ کسی سائنسدان نے بھی آج تک حیات انسانی کے اس بنیادی سوال کا جواب نہیں دیا کہ زندگی ہماری ہے یا کسی کی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا' کیا یہ سوال انتہاء کی اہمیت کا حامل نہیں کہ ہم آزاد ہیں یا غلام۔

دخول اور اخراج کے دو انجام ہمارے ہیں یا ان پر کسی اور کا اختیار چلتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم آزاد ہیں تو کیا کسی انسان کو' چاہے وہ پیغمبر ہو، فلسفی یا سائنسدان' کسی دوسرے انسان کے اخلاقی اور جسمانی رویے Dictate کرنے کا حق حاصل ہے؟ کیا خودغرضی اور خودپرستی ہی وہ بنیادی جبلت نہ ہوگی جس پر کارخانہ حیات کی بنیاد ہوگی۔

کیا ہم پوری زندگی یہ اہم ترین سوال حل کیے بغیر گذاریں گے کہ ہم آزاد ہیں کہ غلام۔ کیا دانشورانِ قدیم و حاضر کا یہ بنیادی اخلاقی اور عقلی منصب نہیں کہ وہ اس ابتدائی سوال کا زندگی کے آغاز ہی میں جواب طلب کرتے تا کہ باقی ماندہ زندگی کی ذمہ داریوں کا تعین ہو سکے۔ کیا ہماری آزادی اور غلامی میں تصور خدا حائل نہیں ہے۔ کیا تمام غور وفکر کرنے والوں کا یہ حق نہیں کہ وہ انسانی فکر کے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ کیونکہ اگر خدا ہے تو ہم آزاد نہیں ہیں۔ ہم نہ چاہیں گے کہ اپنی آزادی کے سب سے بڑے حریف کو جاننے کی کوشش کریں۔ وہ خدا جو زمین و آسماں بنانے کا دعویدار ہے۔ وہ جو ابد لآباد تک زمین کے نظام، اُس کے ذرائع کو' اُس کی آبادی کو، اس کے زوال اور عروج کو' اس کے جنگ و جدل

کے نتائج کو، موسموں کے تغیر وتبدل کو، نسل ونسب کو، اولاد کو، پیشے اور کاروبار کی کمی بیشی کو، صحت اور بیماری کو، تکلیف اور تبسم کو، تباہ کن بادِ سموم اور نرم رو نسیم سحر کو، گل ولالہ پر چمکتے ہوئے شبنمی قطروں اور خزاں کے موسموں میں بے رنگ بے آب زرد پتوں کو، برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں کو، برستے ہوئے بادلوں کو، گہرے سمندروں کو، ساکت و صامت پہاڑوں کو، موت وحیات کے بے رحم تسلسل کو اپنی حاکمیت کے مظاہر قرار دیتا ہے۔ اس خدا کے ہوتے ہوئے ہم کیسے آزاد ہوسکتے ہیں۔ جس کے خلاف نہ طاقت، نہ احتجاج، نہ کوشش، نہ آرزو، نہ علم وعقل، نہ سائنس کوئی بھی انسانی وصف اس کی حکومت میں مداخلت کر سکتا ہے نہ معاونت۔

کس دانا فلسفی نے اور کس بزعمِ خود ذہین سائنسدان نے اس بنیادی سوال کو حل کرنے کی کوشش کی؟ کون تھا جس نے خدا کی تلاش میں زندگی صرف کی اور پھر اپنی تحقیق کے نتائج کے طور پر کہا کہ لوگو تم آزاد ہو، خدا کوئی نہیں ہے۔

مذہب کے معاملے میں شاید سائنسدان سے بڑھ کر کوئی کم ظرف نہیں۔ وہ ایک بنیادی تضاد کا شکار ہے۔ ذرا ایمان کی کہیے کہ ایک سائنسدان ایک دریافت یا جزو دریافت کے لیے زندگی گذار دیتا ہے۔ وہ ایک Equation کے حصول کے لیے 20 تا 50 سال غرق کر دیتا ہے۔ فلیمنگ ایک کلچر پلیٹ پر آٹھ سال مصروف رہا۔ نیوٹن برس ہا برس کی ریاضتِ ذہن کی بنا پر ایک اصول دریافت کرنے کے قابل ہوا۔ کسی نے افلاک کے تجسس میں اور کسی نے ایک وارس کی تلاش حقیقت میں زندگی صرف کی۔ مگر کارل سیگاں اور رسل جیسے

دانشور جب مذہب کی جانب آتے ہیں تو عجیب احمقانہ، فوری اور مشتعل رائے سے نوازنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سائنسی دیانت مصدقہ اور ان کی مذہبی بد دیانتی اظہر من الشمس ہے۔ یہ ان سے پوچھئے کہ ایک معمولی سے مظہر فطرت کے مطالعہ کے لیے اگر آپ کو پوری عمر کے تحصیل علم کی ضرورت ہے تو کیا کائنات کے علیم و حکیم رب کے مطالعہ کے لیے کھلنڈرے اور کم عقل بچوں کی اپروچ چاہیے۔

اور دوسری بات اس سے بھی حیرت ناک ہے۔ جن حقائق کے مطالعہ میں یہ کسی جذباتی، غیر مرئی اور غیر معروضی عقل کے سخت مخالف ہوتے ہیں اور جن کے لیے حقائق کی تلاش میں جذباتی رویہ بدترین طعنہ ہیں، وہ مذہب پر جس عاجلانہ اور احمقانہ طرز فکر کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ ناقابلِ یقین ہے۔

بہت سے کم تر ذہنیت کے سائنس کے اساتذہ صرف شخصی آزادی اور ذاتی طرز فکر کے دفاع کے لیے مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک اور بڑا خدشہ انہیں یہ لاحق ہوتا ہے کہ جو بنیادی، نسلی اور جبلی مذہبی آسیب ان کے سروں پر مسلط ہوتا ہے، وہ کہیں تحقیق مذہب سے تحلیل نہ ہو جائے۔ یہ جان بوجھ کر مذہب کو عقل و فہم سے عاری ایک ایسے Taboo کی طرح سلامت رکھنا چاہتے ہیں، جو بوقت ضرورت انہیں کسی مزار پر، کسی بزرگ کے آستانہ پر یا کسی جعلی مذہبی معالج کے پاس جانے کی رخصت دے۔

بھلا ان سے پوچھو کہ آپ اس خدا کی کیا پرستش کرو گے جو آپ کی معروضی تحقیق

کے چند سوالوں سے بوکھلا کر اپنی کائنات چھوڑ کے بھاگ جائے۔ کیا خدا ازمنۂ قدیم سے آگے نہیں بڑھا۔ صورتِ حیات جو تیر ترکشِ خداوند سے نکلا‘ وہ یقین کے مفروضہ طلسم کو توڑتا ہوا تشکیک کے صحرا میں کھو گیا۔ مگر شیطان بھی کیا بودا ہے۔ عجب خدا ہے جو ابھی ابتدائی Sciences سے بھی آگاہ نہیں اور دعویٰ اصول تخلیق کا مدعی ہے۔ اپنے فرسودہ وسائل کی دنیا کو جدید انسان کی تحقیق سے جدید عقلی اختراعات سے لرزاں دیکھتا ہے۔ گلیور (Gulliver) کی طرح بونوں کے دھاگوں سے جکڑا گیا ہے۔ طاقت اور عظمت کا علم اور حکمت کی معراج سائنس کے چند اصولوں سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرضی وجود پر مطمئن ہے۔ یہی تصور ہے نا‘ سائنسدانوں کے اللہ کے بارے میں...... بہ ایں عقل و دانش بباید گریست۔

فلسفی اور سائنس دان جب تصور الہیات کی طرف آتے ہیں تو ان کا سب سے بڑا مسئلہ تصور اور حقیقتِ وجود کے مابین فاصلہ طے کرنا ہے۔ وہ خدا کے تصور کے قائل ہیں مگر خدا کے حقیقی وجود سے مطلق گریزاں۔ کیا زمانے میں خدا کا کوئی Specialist نہیں گزرا، کیا کسی نے بھی زندگی اللہ کو نہیں دی۔ کیا جستجوئے حقیقت کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھی۔ کیا سرزمینِ عقل پر یقین کا کوئی ایسا پھول نہیں کھلا جس کی بنیاد تحقیق و جستجو پر تھی۔ کیا خدائی عقل و دانش سے ہمیشہ محروم رہی۔ کیا اللہ پر یقین والے ہمیشہ بے بصر جذبات پر بھروسہ کرتے رہے۔ کیا مذہب کا وقت متعین تھا اور کیا آفتابِ عقل کے طلوع میں مذہب کور چشم چمگادڑ کی طرح الٹا لٹک کر اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔

یعنی فلسفی صرف تصوراتی خدا پر بات کرتے ہیں جبکہ حقیقی خدا سے گریز۔ اور حقیقی خدا پر صرف صوفی ہی بات کرتا ہے۔

یہ خوف کہ ہماری جدید معلومات کی روشنی میں ربّ کائنات کا علم کہیں دقیانوسی نہ

نکل آئے، کتنا مہمل اور احمقانہ ہے۔ بہت سے سائنسی فکر کے لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ اللہ کی کتاب سے سائنسی توجیہات نہیں تلاش کرنی چاہیے۔ اور فرض کرو اگر اللہ کو شوق ہو کچھ سائنسی حقائق بیان کرنے کا تو آپ کیا کریں گے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ الہامی کتاب سائنس کی کتاب نہیں مگر کتابِ تخلیق ضرور ہے۔ یہ امر محال ہے کہ اس میں آفرینش کائنات پر، حیات پر، انجام کائنات پر، اسباب اور وسائل کائنات پر اللہ کے احکام درج نہ ہوں۔ آپ کا کام تحقیق وتنقید ہے تو شوق پورا کیجئے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انسان ہزارہا غلطیوں کے باوجود اپنے انسانی Status سے محروم نہیں ہوتا اور خدا ایک غلطی بھی کرے تو خدا نہیں رہتا تو آپ انسانوں کی اس مصیبت میں ان کی مدد کیوں نہیں فرماتے۔

کیوں نہیں آپ جرأت اور ہمت فرما کر قرآن کا بخوبی مطالعہ کر کے تحقیق اور جستجو کے اسی انداز سے جس سے آپ سائنسی حقائق کا مطالعہ کرتے ہیں، اعلان فرماتے کہ خدا کو تو بنیادی سائنسی حقائق ہی کا علم نہیں ہے۔ یہ کہ وہ مراتب فکر کائنات کم جانتا ہے۔ یا کہ وہ قافلہ صحرا کا وہ داستان گو ہے جو عموماً مسافروں کی تھکن دور کرنے کے لیے ماورائی داستانوں کا سہارا لیتا ہے۔ ہاں میں نے لفظ قرآن لکھا ہے۔ اس کی وجہ خاص ہے کہ ایک تو یہ محفوظ ترین کتاب مذہب ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے سوا اللہ کسی اور کتاب کی ضمانت نہیں دیتا۔ اس کے ہر جملے اور فقرے کی اور اس میں درج تمام حقائق کی شخصی ضمانت دیتا ہے۔

ایک غلطی کی نشاندہی اور اللہ سے نجات، کتنا آسان ہے صدیوں کے آسیب کا

علاج۔ مگر ہر فلسفی اور دانشور کو اس تنقید کے لیے اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ آرام کرسی پر تفریحِ احساس کے ساتھ یہ تنقید نہیں ہو سکتی۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ جستجو اور تحقیق طویل اور الم انگیز۔ آیئے جائزہ لیجیے اس طرزعمل کا جو ماہر عمرانیات خدا کے بارے میں رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خدا ضرورتِ انسان ہے۔ اس نے یہ تصور اپنے خوف و وحشت کے بحران میں واحد طرزِ نجات کے طور پر گڑھا ہے۔ یہ کہ ہر معاشرے کا خدا اپنا ہے۔ یہ تفاوت بذات خود اس بات کا مظہر ہے کہ خدا مفروضہ ہے۔

مگر غور فرمایئے کہ عالم عمرانیات اللہ پر نہیں تحقیق فرما رہا۔ اس کو کوئی شوق نہیں کہ وہ اللہ کو جانے، سمجھے اور اس کے بارے میں رائے دے۔ یہ رائے تو وہ اس تصور کے بارے میں دے رہا ہے جو معاشرے میں دوسرے معاملات کے ساتھ موجود ہے۔ کوئی معاشرہ جانور کا شکار کیسے کرتا ہے اور گھر کیسے بساتا ہے اور غیر مرئی وجود کے آسیب کو کیسے سلامت رکھتا ہے۔ عمرانیات کے فلسفی کو دلچسپی خدا سے نہیں بلکہ اُس تصور خدا سے ہے جو کسی Social Unit میں کسی تہذیبی دور میں خودرو پودے کی طرح اگ آتا ہے۔ البتہ عمرانیات کے مطالعہ میں مجھے ایک بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جس ابتدائی انسان کو منہ دھونا نہیں آتا تھا، دانت صاف کرنے نہیں آتے تھے، گوشت پکانا نہیں آتا تھا، گھر بسانا نہیں آتا تھا، جس کے پاس صحن اور ڈرائینگ روم کا کوئی تصور نہیں تھا، سبزیاں اگانے کا فعل مفقود تھا۔ کھیتی باڑی دور کی بات تھی، بیج ناپید اور فصل ناپید، جو Habilis اور Erectus کی صورت جس کی خاطر شب و روز جنگلی درندوں کی طرح مچان پر بیٹھا تھا۔ جو عورت کی ضرورت کے سوا کسی اور جذبے سے آشنا نہ تھا۔ کیا عجیب بات ہے کہ اس نے پہلا کام خدا کے بارے میں جاننے

کا کیا۔ پہلا تمدن ہی مذہبی تھا۔ تمام ابتدائی انسانی معاشرہ Priest مذہبی معاشرہ تھا۔ وہ رسوماتِ مذہب ادا کر رہا ہے۔ مردے دفنائے جا رہے ہیں۔ دعائیں پڑھی جا رہی ہیں۔ چین اور عراق کی اموات پر پھول چڑھانے کی رسومات بھی موجود ہیں۔

کیا یہ تو نہیں کہ اس مجبور اور معذور عقل انسان کو کوئی Alien معلم مہیا تھا۔ یہ تو نہیں کہ عقل کے ذرہ برابر فشار کے ساتھ ہی اس نے سب سے پہلے کسی ربِ عظیم کا مظاہرہ دیکھ لیا۔ کیا یہ تو نہیں کہ اس کے وسائل میں کوئی بہتر اور برتر وسیلہ کسی خارجی طاقت کے ذریعے اسے قدم قدم آگے بڑھا رہا ہو۔ جب ماں ابھی اپنی فطرت سے نا آشنا تھی، کوئی اُسے بچے کی ناف کاٹنے کا سبق دے رہا ہو، کوئی درند و پرند سے بچنے کے لیے اینٹ پر اینٹ رکھنا سمجھا رہا ہو کوئی انہیں بہتر ابلاغ کے لیے اشارہ اور کنایہ سے لفظ اور معنی کی طرف بڑھا رہا ہو۔

چلیے اس بات کو ثابت کرنا مشکل ہے۔ فلسفی اور سائنسدان برا مان جائیں گے۔ اتنے پرانے خدائی تصور کے خیال سے ان کے اذہان چیخ جاتے ہیں۔ وہ پہلے ہی بیچارے بہت تنگ ہیں۔ اتنے برسوں کی محنتِ شاقہ کے باوجود جو حقائق قرآن سمجھ بیٹھے تھے، ایک صدی کی مسافت بھی طے نہیں کر پائے۔ کبھی کشش رفتار سے معطل ہو جاتی ہے۔ کبھی عمومی اضافت خصوصی اضافت سے معطل ہو جاتی ہیں۔ کبھی روشنی سے تیز تر رفتار شعاع ان کے سابقہ نتائج منفعل کر دیتی ہے۔ کبھی بے یقینی (Uncertainty) ان کا منہ چڑھاتی ہے۔ کبھی ایک کائنات متعدد کائناتوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ کبھی کوانٹم بے بسی کا شکار نظر آتی

ہے۔ کبھی حیات کی جہات (Dimentions) کی تحدید ناقص، کائنات کا بکھراؤ مستند مگر سکڑاؤ مخدوش، ازل مخصوص اور مقرر مگر ابد لا انتہا اور مسلسل۔ ٹوسٹر، اوون، کار، ریل اور جہاز کے یا پھر بارودی سرنگوں، کلسٹر، سمارٹ اور نیوکس کے سوا سائنس تفہیم کائنات میں مسلسل ابہام کا شکار ہے۔ اور جو اصولِ تحقیق و جستجو سائنس وضع کرتی ہے‘ وہ اتنی دیر بھی قائم نہیں رہتے جتنی دیر صحنِ چمن میں نسیمِ سحر کی عشوہ طرازیوں سے گلِ نوروز کی آبرو —— وقت کا تعین تو اضافی ہے۔ آپ خیال کرتے ہیں کہ میں اس نوجوان کی طرح ہوں جو ثقہ بزرگوں کے علم اور تجربے کا مذاق اڑا رہا ہوں نہیں‘ بلکہ میں اس پسماندہ راہرو کی طرح ہوں جو صحرا میں تمام نشان ہائے منازل کے قریب جا کر انہیں سراب و واہمہ دیکھتا ہے اور اپنے علمی اور عقلی راہبروں پر غم و غصہ سے مہذبانہ دشنام طراز ہے۔

زندگی ترجیحات کی ترتیب کا تعین ہے۔ کیا ذہنِ انسان نے یہ نعمت اپنی ذات سے حاصل کی۔ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ یہ صلاحیت ذہن کی قائم بالذات ہے۔ درجاتِ فہم و فراست کیسے بھی ہوں، غیر محسوس طریقے سے ہر انسان اپنی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔ معمول کے واقعات و حالات ہیں۔ یہ ترتیب نہیں ٹوٹتی مگر جب کوئی غیر معمولی حادثہ یا واقعہ وقوع پذیر ہو تو یہ ترتیب معطل ہو جاتی ہے اور فوری اور اہم تر ترجیح اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ذہنِ انسان کی دوسری اہم خاصیت ترجیحات کی زمانی تشکیل ہے، ترتیب ہے۔ تعلیم و ہنر رزق اور استحکام فوری اور ضروری ترجیحات سمجھی جاتی ہیں۔ ذہن انہی ترجیحات کو اہم تر قرار دے کر عمر تمام کرتا ہے اور اہم ترین ترجیح کو عمر کے اس حصے میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو ناقص اور ارذل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، تمام تر ذہنی صلاحیتیں چند بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، باوجود تمام مذہبی تنبیہات کے وہ پوری زندگی کی واحد ترجیح اول غیر متناسب زمان و مکاں میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ناقص طرزِ عمل میں اس کی جبلی خواہشات اور ذہنی تکبرات معاون ہوتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل باوجود ہر چیز کے حصول کے

انسان کے اضطراب اور اضمحلال میں مسلسل اضافہ کرتا ہے اور اطمینانِ قلب موقوف کردیتا ہے۔ بہت سے لوگ ایک مکمل مایوسی کے بحران کا شکار ہوجاتے ہیں اور آخری لمحات میں واپسی سے مایوس ہوکر مسلسل تاریکیوں کے مسافر ہوکر رہ جاتے ہیں۔

شاید یہ وہی مقام ہے، جہاں نہ چاہتے ہوئے ذہانتوں کے مدعی انکارِ خدا بھی کرتے ہیں اور انکارِ حقائق بھی۔

آزادی اور بندگی کے اس اہم ترین سوال میں اقرارِ خدا لازم نہیں ہوتا مگر شاید یہ جاننا کہ خدا ہے کہ نہیں، بہت ضروری ہوتا ہے۔ خدا کو نہ جاننے کا رسک اتنا بڑا ہے کہ اربوں سال کا مستقبل نہ صرف مخدوش ہوجاتا ہے، بلکہ عذاب ناک بھی۔ علمائے فکر کے تعصبات زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے تکبرات خفی اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ وہ سائنسدان ہوں یا فلسفی، سیاست دان ہوں یا ادیب، ذاتی وجوہ کی شناخت اور توقیر کی وجہ سے اس سوال سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ خود بھٹکتے ہیں اور جملہ انسانوں کے بھٹکاؤ کا سبب بنتے ہیں۔ بقا اور شہرت کے ایوانوں میں خوفِ آخرت، احتساب غیر حقیقی اور افسانوی لگتا ہے۔ دوسری جانب دیکھیں تو خدائے عظیم یہ جانتے ہوئے کہ انسان نے بہترین وقت اور عقل ادنیٰ درجہ کی ترجیحات میں صرف کردی ہے اور بنیادی اہم ترین ترجیح سے احتراز کیا ہے، ان کو ایک مسلسل اضطراب اور غفلت میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہ حالت سکرات کی بے ہوشی تک محیط ہوتی ہے۔ انکار سے بدتر وہ تساہل ہے کہ جس کی وجہ سے فریضۂ اول سے غفلت انسان کا مستقل رویہ بن چکا ہے۔

چاہتا تو میں بھی ہوں کہ میں علم و ادب کی شخصیات کا رومانوی تصور بحال رکھوں مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک دانستہ کوشش سے نسلِ انسان کی اہم ترین ترجیح کو مسخ کیا گیا ہے اور کم اہم ترجیحات کو اہم تر بنا کر پیش کیا گیا ہے اور بقائے حیات کو نجات سے آشنا کرنے کے بجائے غفلت و بدگمانی کا شکار کر دیا ہے، تو یقین جانیے کہ اس گروہِ دانشوراں پر ہلاکتِ انسان کا الزام لگتا ہے۔ شاید یہ وہ مسخ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم بار بار کرتا ہے۔

عجیب بات یہ کہ انکارِ خدا کسی ذہنی تحقیق اور مسلسل فکری جد و جہد پر مبنی نہیں۔ بہت سارا انکار صرف ذاتی محرومیوں کا ردعمل ہے۔ اکثر انکار اس مفروضہ ناانصافی (Injustice) پر قائم ہے جو انسانوں کے اسباب کی تفریق میں ہے۔ مال و اسباب اور عزت و حکومت کا تفاوت، احساسِ کمتری، توہینِ ذات، حسد و کینہ، غیض و غضب کا باعث بنتا ہے، جو کبھی مارکس اور لینن کے منفی ردِعمل کا اظہار اور کبھی فلسفہ وجودیت کے انکارِ روح و خیال کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان دنیا کو اپنی محدود معلومات اور علاقائی تصوّرِ انصاف سے چلانا چاہتا ہے۔ وہ شاید بھول جاتا ہے کہ اللہ ایک انسان یا ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ جملہ نسلِ انسانی کا ہے۔ مذاہب کی تقسیم غیر فطری ہے۔ اگر مذہب سے مراد تلاشِ خدا ہوتی تو تمام مذہب پرست خدا پرست ہوتے اور ان کے معیارِ عدل و انصاف میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ خدا کے احکام کی ناقص تعمیل مذہبی منافرت میں ڈھل گئی اور جس سبب نے جملہ انسانوں کو متفق اور متحد رکھنا تھا، کم عقلوں کی توجیہات کی وجہ ہے۔

برصغیر میں تاریخ تصوف کا تذکرہ شاید اسی لیے ضروری ہے کہ یہ لوگ جن سے اللہ کی پہچان ہوتی ہے، ان کے افعال و کردار خدا کے نشان ہوتے ہیں اور شاید دیوجانس کلبی (Diogenes) اور زینو (Zeno)، ڈاینونیسیس، پلاٹائی نس، آگسٹین، ایکویناس اور پھر ایک طویل فہرست مسلمان صوفیا کی جنھوں نے تزکیہ ذات اور بہترین ترجیحات کے تجزیے کے ساتھ اپنے اندر بھی خدا کا اخلاص، محبت اور شعور پیدا کیا اور دوسروں کے لیے بھی ایسے واضح نشان چھوڑ دیے جس سے عامتہ الناس میں بھی رجعت فکر خدا قائم رہی۔

اسلام میں صوفیا اس لیے بھی کثرت اور تواتر سے آئے ہیں کہ اس مذہب میں خدا کا تصور بہت واضح اور طریق ہدایت بہت روشن ہے۔ خدا کا تصور بھی ابہام سے مکمل پاک ہے اور رسالت کا کردار بھی شفاف ہے۔ کسی بھی تقلید کرنے والے کو قرآن سے بہتر کتاب اور محمد رسول اللہؐ سے بہتر استاد نہیں مل سکتا۔ کتاب کی مکمل حفاظت اور احادیث رسولؐ کے وسیع اور مصدقہ ذخائر نے زندگی کی ہر راہ کا طرز عمل غیر مبہم کر دیا۔ اسلام میں تصوف جداگانہ یا انفرادی نہیں، عمومی نظریہ ہے۔ اخلاص، شعور ذات کی جدوجہد، توازن اور اعتدال کی ہر

کوشش فطرتاً اللہ کو جاتی ہے۔ صرف قرآن ہی سے اللہ کا کائناتی تصور پیدا ہوتا ہے۔ باقی مذاہب میں انسانوں کے ذاتی خیالات اور تعصبات کی وجہ سے خدا قومیا لیا گیا۔ ہر قوم اور گروہ نے اللہ کو ذاتی میراث سمجھ کر اپنے خاندان اور قبیلے کے لیے مختص کر لیا اور اپنے آپ کو مقام محبوبیت عطا کر لیا۔ اس کی کوئی ضمانت خدا کے کلام میں خدا کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔

قرآن سے معلوم ہوا کہ کائنات کی وسعتیں رب عظیم کی تخلیق کا معمولی تاثر ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے انتہا اور بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا باپ، بیٹا یا بھائی کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا کرشمۂ جمال مکروہ بتوں کی تمثیل میں اجاگر نہیں ہوسکتا۔ وہ صاحب اوصاف انسانوں میں افعال و کردار کا صلہ رشتوں کی قرابت سے نہیں طے کرتا۔

اس کی ربوبیت انکار و اقرار سے بالا ہے۔ وہ کافر و مسلم کو ایک طرح سے رزق دیتا ہے بلکہ کافر کو مصلحت کے تحت زیادہ دیتا ہے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر بغیر علم فہم و ادراک کی حدود میں نہیں آتا۔

زیادہ علم ہی زیادہ شناخت کا باعث ہے اس لیے صوفیا نے علم خدا کو اور شناخت ذات کو واحد ترجیح قرار دیا کہ ان تمام پیروں اور ملاؤں کے ہجوم میں ایک بھی ذات شناسائی خداوند کے ابتدائی مراحل طے نہیں کرتی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اپنی شیطنت اور خبث باطن کو چھپانے کے لیے تسلسل سے ماورائی حکایتوں میں عوام الناس کو الجھا کر اپنے ذاتی مطالبات و اغراض پورے کیے۔ اور دوسرے کچھ لوگ جن میں اگر شعور و اخلاص کی رمق موجود بھی ہو تو

وہ اس سلسلۂ دروغ بافی سے کبھی نکل ہی نہیں پائے اور تاریکی کا سفر جاری رہا۔ اعتبار کرنے والا اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ وہ نہ صرف اس پورے طلسمی نظام سے مسحور ہے بلکہ وہ اس حد تک فریب خوردہ ہے کہ اپنے آپ کو تقلیدِ محض کا اسیر کرکے جرأتِ سوال نہیں کرتا۔

جادو، تعویز و وظائف

مُلائیت کا تصوف

شریعت اور طریقت کے دونوں راستے عطائیوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ علم وحقیقت خرافات کی نذر ہوگئے۔ لاطائل اور طویل وظائف کے ڈھیر لگنے شروع ہوگئے۔ چلّہ، وظائف، تسخیرات، عملیات، حاضرات کی دنیا آباد ہوگئی۔ ہر گلی اور کوچہ کا نظام تعویذات کے عاملین کے حوالے ہوگئے۔ اب کوئی ذرہ رزق، کوئی کام، کوئی شادی بیاہ، کوئی نوکری چاکری، تعویذ کے بغیر ممکن نہیں۔ خدائی اب جادوگروں کے سپرد ہوئی اور ایسے لگتا ہے کہ ان لوگوں نے مل کر اللہ کو کائنات بدر کردیا۔ ایسے بھی لوگ کم رہ گئے جنہوں نے خاندانی بھرم بحال رکھے ہوں۔ تصوف کے نام پر مکروہ صوفیانہ مسالک اور ملائیت کی جنگ میں برصغیر کے دونوں اطراف کے اذہان نے جھوٹ اور سچ کی تفریق ختم کردی۔ لاطائل اور بے سروپا داستانوں کے ہجوم میں حقیقتِ الٰہیات گم ہوگئی۔ ملائیت نے یہ دیکھ کر کہ عامۃ الناس میں تصوف کے مدعیان زیادہ مقبول و محبوب ہیں، اپنی جماعتوں میں دعویٰ تصوف کو جگہ دی مگر چونکہ مراتبِ فکرِ تصوف سے نا آشنا تھے اور حرص و آز کے کارخانہ دراز میں صوفیانہ طاقتوں کی ایسی مائی تھالوجی (Mythology) تیار کی گئی کہ جاننے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ مولوی طرزِ فکر نے سخت تر اصولِ بیعت قائم کیے اور فری میسنری کی طرح متحارب نظریات پر اپنے مریدین کو ایسے نظام مدرسہ کا قیدی بنادیا کہ نہ ذہن آزاد رہا نہ اعمال۔ حیران، سراسیمہ، پریشان یہ لوگ الموت (Alamut) کے حشیشین کی ان تحریکوں میں الجھ

گئے اور تشدد، نفرت اور استحصال کی روایات باقی رہ گئیں۔ دوسری طرف نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ اور چشتیہ کے نام پر مخصوص خاندانوں نے اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اور مضبوط پیرانِ تسمہ پا کی طرح مخلوق کی گردنوں کو کس لیا۔ تصوف کے شاہین تو اللہ کے پاس پہنچ چکے تھے اور ان زاغوں کے تصرف میں بیعت، نیاز اور قوالی رہ گئی۔ ایک عمومی معلوماتی جائزہ میں یہ بات کھل جاتی ہے۔

دنیوی اختیارات کی جنگ میں استادانِ معظم کے پس ماندگان ہر اخلاق سے بالا تر ہو کر زمین، زر، مسند اور اختیار کی ہوس کے شکار ہو گئے۔ ملائیت، پاپائیت اور یہودیت کی طرح نظامِ تحفظ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئی اور نیک نیت مخلصین کی جگہ تربیت یافتہ جنگجوؤں نے لے لی۔ اسلام اور اللہ کی شناخت قتل و غارتگری سے ہونی شروع ہو گئی۔ سیکولر کو ایک اور بہانہ مل گیا۔ اسے اپنی تہذیبی برتری اور تمدن کی آزادی کے لیے ایک اور دلیل مل گئی اور وہ انتہائی سفاکی سے مذہب اور خاص طور پر اسلام کے ماننے والوں کے پیچھے پڑ گیا۔ یحسرۃ علی العباد۔ کہاں تو وہ مذہب حقیقت کبریٰ کو پانے کا واحد حل اور کہاں یہ مذہب جس میں صرف ذاتی تعصبات کی سڑاند۔ کہاں مذہب علم العلوم اور کہاں یہ مظاہراتِ جنوں۔ کہاں وہ شناسایانِ رموزِ پروردگار اور کہاں یہ قاتلانِ اخلاق و کردار۔ کہاں بایزیدؒ، جنیدؒ، رابعہؒ و حسنؒ اور کہاں صرف مولوی، مولوی، مولوی، مولوی۔۔۔۔۔

اس خودستائش گروہ نے انکسار کے تمام طریقے باطل کر دیے۔ لوگوں کے اذہان پر قابو پانے کے لیے اپنے معمولی اور چھوٹے چھوٹے اساتذہ کو اکابرین کا نام دیا اور بڑے

بڑے خطابات از خود اپنے آپ کو بخشے۔ مجھے آج تک کوئی ایسا قرینہ نہیں نظر آیا جو صوفی کو دعوئ کرنے کی اجازت دے۔ مجدد الف ثانی کا خطاب کہاں سے آیا، کس کو ملا، کس نے دیا۔ شیخ العرب والعجم، پیر لاہوت، صاحبِ شش جہات، قیوم زمانہ، غوثیت، قطبیت یہ تمام مناصب برصغیر کے پیرانِ تسمہ پا اور مولویانِ تقدس مآب نے سمیٹ لیے۔ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن۔۔۔۔ اولیائے طاغوت کے تمام انداز مذہبی اور فقیرانہ تھے۔ تلاشِ حق کا کام بہت مشکل ہوگیا۔ سوائے ایک تجسس اور مہم جُو فکر کے اور کوئی بھی یہ طلسم ہوش ربا تسخیر نہیں کرسکتا۔

علم اور عالم دونوں مفقود ہوئے۔ سیکولر، صوفی اور ملاّ کے مقاصد جدا جدا اور ذاتی تھے مگر حصول طاقت و وجاہت میں ایک ہی طرح کے سفاک۔ مذہب کے استعمال میں بے حس اور بے باک۔ بدترین جنسی برائیاں، مالی بدعنوانیاں، ذہنی خباشتیں گاہے گاہے ہر سہ فریقین کی اندرونی کہانیاں سنا دیتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اختیار ابھی سیکولر اور ملاّ ہی کے پاس ہے۔ ابھی شاید اسلام کا زمانہ نہیں آیا اور مہدی تو ابھی دور لگتے ہیں۔

اسلام مسلمانوں کی میراث نہیں اور نہ مسلمان علمائے مذہب کی ذاتی خواہشات ہی کا کارندہ۔ اسلام ہر فرد و بشر کا ہے۔ جس کو جہاں بھی خدا کی تلاش ہوگی اور وہ اس کے لیے کسی رستے کا انتخاب کرے گا' وہ اسلام ہی تک پہنچے گا۔ غیر اقوام میں اسلام کے خلاف تعصب مسلمانوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جنگ وجدل' قتال کی ان صدیوں میں جہاں کفر و اسلام ایک دوسرے سے جنگ آزما رہے' اسلام خدائی شناخت کا مذہب ہونے کی بجائے

ذاتی اور قومی مذہب سمجھا گیا۔ اور یہ سراسر غلط فکر کا نتیجہ تھا۔ یہ وہی غلط اپروچ تھی جو یہودیت اور عیسائیت نے اپنے مذاہب کے بارے میں پیدا کی۔ دینِ موسیٰ اور توریت کو ذاتی ملکیت سمجھ کر یہود نے اس پر نا جائز تصرف کیا اور کتاب اللہ کی حیثیت کو قبیلوں کے تعصبات کی بیاض میں بدل دیا۔ اس طرح انجیل مقدس بھی عیسائیوں کی چیرہ دستی کا شکار ہوئی اور علمائے عیسائیت نے اس میں اپنے مطالب کے لیے تحریفات تخلیق کیں۔ اجتہادِ فکر کی تو اللہ نے ہر دور میں اجازت بخشی تھی مگر تصرف فی الآیات کی اجازت ان لوگوں نے اپنے طور پر حاصل کر لی اور جملہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے رستے شخصی، قبائلی اور قومی ہو کے رہ گئے۔

ملاّ تمام مذاہب میں کم تعلیم رہا۔ لادینیت ہمیشہ وجاہت طلب رہی۔ ملائیت اور لادینیت کی جنگ اصولاً روح وبدن کی جنگ ہونی چاہیے تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ دونوں کا مطمحِ نظر حصول اختیار تھا۔ اگر چہ آج سیکولر کو غلبہ حاصل ہے، مگر مولوی سخت جان ہے اور فطری جبلی ذہانت کا مالک ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ لادینیت ذہن انسان کو سکون نہیں پہنچا سکتی۔ وہ اسباب زندگی تو مہیا کر سکتی ہے مگر سکون و طمانیت نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ مذہب کی دعویدار یہ جماعت اس وقت کے انتظار میں ہے جب لوگوں کی تمنائے سکون و اطمینان ضروریاتِ زندگی سے بڑھ جائے گی۔ تب وہ اپنے حصارِ حفاظت سے نکل کر پھر ایک مرتبہ اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں پھر تاریخ کے اس عمل میں خدا اور خدا شناس ایسے عظیم بحران کو سمیٹنے کے لیے دوبارہ ترجیحات استوار کرنے کے لیے عیسیٰؑ اور مہدی پلان کر رہے ہوں گے۔

فلسفۂ ترجیحات میں سب سے بڑی رکاوٹ ترغیبات نفس ہیں، جو کردار سازی اور مطمح زندگی کی شکل میں ہماری پوری زندگی پر محیط ہوتی ہیں۔ کسی بھی کرداری صلاحیت اور پیشے کا انتخاب اوائل ہی میں ہمارے اذہان پر اس طرح مسلط ہوجاتا ہے یا کردیا جاتا ہے کہ ہم تمام عمر اس کے پیچ وخم میں گذار دیتے ہیں اور اس کو اپنے اور زندگی کے لیے لازم اور احسن قرار دیتے ہیں۔ کرشن مہاراج کی زبان میں جب کوئی خواہش ہمارے اذہان پر مسلط ہوتی ہے تو عقل کو اتنی ہی دور پھینک دیتی ہے جتنی تند وتیز ہوائیں ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی کو سمندر کی بے کراں وسعت میں تند وتیز ہواؤں کے سپرد کردیتی ہیں۔ Career اور Character کا یہ جنون خالصتاً دنیاوی وجاہتوں کی پیداوار ہے، جو معاشرتی اور معاشی تقابلات سے ہمارے اندر جنم لیتا ہے اور نا آسودہ خواب بن کر تمام زندگی سراب حقیقت کی طرح ہمارا تعاقب کرتا ہے۔ یہ جنون نہ ہمیں قیام کرنے دیتا ہے نہ اصل حقائق ہی کو جانے کی مہلت دیتا ہے۔ محرومیوں کے اس بحران میں آرزو نئے نئے بہروپ بدل لیتی ہے اور قبر تک خواہشات کے ابتلا میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہ وہ خودرو بیلیں ہیں جن کی تمام تر زندگی کا انحصار ترجیح اول پر ہے۔ وقت اور قوت کا ضیاع اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اصلی اور حقیقی مسئلہ دور

افتادہ یادداشت کی طرح دشتِ نسیاں میں کھو جاتا ہے۔ مدتوں بعد ایک بھولی بسری یاد کی طرح جب ہم واپس پلٹتے ہیں تو عادات اتنی راسخ اور تساہل اتنا پختہ ہو چکا ہوتا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی ہم حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ سکرات و غمرات سے پہلے اگر یہ خیال آ بھی جائے تو ہم صرف رحمتِ بے کراں کے سہارے ہی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا سامانِ رہِ عافیت نہیں ہوتا۔

یوں عقل و دانش کے خود پسندانہ مشاغل بے شمار ہیں بلکہ خود پسندی ہی سب سے بڑا شغلِ عقل ہے۔ علم و عقل کے ساتھ خود پسندی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ کم علم کی خود پسندی کا انحصار مال و اسباب پر ہے اور تعلیم یافتہ خود پسندیدیت انفرادیت کی شائق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں کوئی منفرد نہیں۔ تمام انسانوں کی کیمیائی ہیئت ایک ہے۔ افعال کے زیر و زبر سے کوئی انسان وصفِ انسانیت چھوڑ نہیں جاتا۔ جرائم سے اخلاقی اوصاف تک انسان پٹڑیاں بدلتے رہتے ہیں۔ جہالتوں سے اعلیٰ تعلیمی روایات تک ایک تسلسل ہے جس سے جملہ انسانی نسل اپنے اپنے کردار نبھاتی چلی آتی ہے۔ انوکھے تو شاید وہی لوگ ہیں جن کی مانند ہم سے کوئی بھی نہیں بن سکتا۔ ہم کوشش کے باوجود یقیناً عیسیٰؑ و محمد (ﷺ) نہیں ہو سکتے۔ اس انتخاب کے دروازے ہم پر بند کر دیے گئے۔ زمان و مکاں کے مراحل میں یہ وہ روشن ضمیر لوگ ہیں جن کے وجود ترغیب و تحریص کی آندھیوں میں بھولی بھٹکی انسانیت کو رہِ نجات متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کو کوئی مانے نہ مانے' یہ اپنے فرائض بے صلہ ادا کرتے ہیں اور شاید ان کے بغیر انسان کے مستقبل کا بہت پہلے فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ شاید زمین ہی کو جہنم کی Annexe قرار دے دیتا۔

بڑا مسئلہ ذہنِ انسان کی خود شناسی کا ہے۔ خود رو بیل کو اگر وقت پر کاٹا نہ جائے تو مکڑی کے جالوں اور باہم دگر پیوست شاخوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ خواہشات ذہنِ انسان کو اس طرح گھیر لیتی ہیں کہ عقلِ راست کی روشنی پہنچنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہرج کی تعریف ایک چرواہے نے عمر فاروقؓ سے یہ کی کہ یہ وہ قابلِ خوراک جھاڑی ہے جو اتنے کانٹوں اور زہریلی شاخوں میں الجھی ہوئی ہے کہ جانور اسے اپنی خوراک بنانے سے معذور ہوتے ہیں۔ دل پر جب خواہشات کا استحصال بڑھ جائے اور ذہن ترجیحات کے جنگل میں الجھ جائے، تو عقل اور عبرت کا کوئی درس اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ کٹاؤ (Weeding) بہت ضروری ہے۔ دانشمند وہی ہے جو احتساب کی مقراض سے خواہشات اور ترغیبات کو کاٹتا ہے اور خود پسندی کے بحران میں گرفتار نہیں ہوتا۔

چاہے کوئی چیز اور مقام کتنا ہی پسندیدہ ہو، جب ترجیح اول کو متاثر کرنے لگے تو اس شوریدہ سر کو کاٹ دے۔ نفسِ انسان اپنی محبت پر زندہ ہے۔ نرگسیت اس کی صفتِ اولیں ہے۔ اپنے خلاف سوچنا اس کو کسی حال میں منظور نہیں ہوتا۔ اللہ نے عقل نفسِ انسان کی اس صفت کے مقابل رکھ دی۔ خود انسیت ہی خود شناسی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے مظاہر بے شمار اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں۔ یہ ہر انسان کے محبت اور تعلق میں نمایاں، علم و ادب کی تمام روایات میں موجود اور فلسفہ حکمت کے ہر صفحہ پر مرتسم۔ یہ خود انسیت ہم سے احساسِ خطا چھین لیتی ہے۔

اپنے آپ کو اچھا کہنے کا اُنس اور بُرا کہنے سے گریز خود انفسیت کا خلاصہ ہے۔

نفس اپنے دفاع کا استحقاق ہر قیمت پر قائم رکھتا ہے اور نفسِ انسان سے بڑھ کر اللہ نے اپنا دشمن کوئی بھی نہیں بنایا۔ جبلی عادات کے پیکیج (Package) ہی کو نفس کہتے ہیں۔ عقل اگر کارساز ہے تو جبلت حیلہ ساز اور چالاک ہے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ خود انفسیت کی وجہ سے عقل بھی حیلہ ساز جبلت کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ اخلاقی بحران اتنے کیوں بڑھ جاتے کہ حکومتیں بدترین انسانی کردار کو جمہوری آزادیوں کا شرف سمجھتیں۔ مغربی دنیا کے اخلاقی افلاس کی واحد وجہ اس کی تمام تر عقلیت کا جبلی انفسیت کے دام میں الجھنا ہے اور زمانہ قدیم کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی بڑا حادثہ فاجعہ ہی ان کو وہ شاک دے سکتا ہے جو جبلی خودپسندی کو غیر مستحکم کر کے ایک دفعہ پھر صراطِ عقل پر گامزن کر دے۔

مذہب کی اعلیٰ ترین اقدار کو سمجھنے کے لیے خودشناسی پر اتنا اصرار کیا گیا کہ خود شناسی اور خدا شناسی ہم رنگ ہو گئیں۔ مگر کیوں۔ انسان خود تو خدا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو جان کر کسی الٰہیاتی مفہوم تک پہنچ جائے۔ دراصل خودشناسی آج کے مطابق نفسیاتِ ذات کی

آگہی ہے۔ خدا کی تلاش ایک مکمل اعتدال کا خلاصہ ہے اور جب تک ہم اپنے ذاتی تجزیہ اور تحلیل سے نہ گذریں، ہمارے مذہبی یا سماجی نتائج مصدقہ نہیں ہوسکتے۔ لالچ فریب، احساس کمتری، احساس عظمت، طلب جاہ، وجودیت نرگسیت اور ہزاروں باریک تر نکات ایسے ہیں جن کا فہم اپنے آپ کو سولی پر چڑھائے بغیر نہیں ہوسکتا۔ کسی کی توجہ اور تعریف آپ کے ہونٹوں پر جو ایک تبسم کھلا دیتی ہے، آپ کے برسوں کی ریاضت کے نتائج کا رُخ بدل دیتا ہے۔ ذہن جب کسی خوشامد کی حرص کرتا ہے تو اپنا فتوئ قتلِ عقل لکھ رہا ہوتا ہے۔ ''آخری چیز جو سینۂ انسان سے نکلتی ہے حُبِ جاہ ہے۔'' غزالیؒ نے کہا۔ جو کوئی بھی ''ہم ایسے بنائے گئے ہیں'' (we are made so) کے فلسفہ کے قائل ہیں، وہ کبھی عرفان کی دہلیز نہیں چھو سکتے۔ باوجود انتہائی معروضی (Objective) تعلیمات اور توجیہات کے اہل مغرب کے فلسفی اور دانشور اپنی اصلاح کے لیے کسی تکلیف کے عادی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ جیسے بنائے گئے، اس سے بہتر کوئی صورتِ تخلیق نہ تھی۔ وہ شہرت اور وجاہت کو نقصِ فطرت نہیں، بلکہ حق منصبی سمجھتے ہیں۔ مصروفیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا یورپ اور مغربی ذہن داخلی کیفیاتِ عجز سے نا آشنا ہے۔ فخر ومباہات، شہرت وعزت و وجاہت کوئی ناقابلِ نفرت اوصاف نہیں بلکہ یہ ان کے نزدیک زندگی کے فطری مقاصد ہیں اور ان کے لیے جدوجہد کرنا قطعاً غیر معقول نہیں۔ ایک ذرہ برابر احساسِ زیاں نظر نہیں آتا۔ شاید معروضی حیثیت کا یہ احتمال ان کے مکمل نسیان کا باعث ہے۔ صدیاں گذر گئیں کہ اہل مغرب میں کوئی صوفی اور خدا شناس نہ پیدا ہوا اور صدیاں ہی گذر گئیں کہ ان کو کبھی اس کا احساس زیاں بھی پیدا نہیں ہوا۔

بہت سے لوگ معترض ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سارتر، کامو، روسو، دوستوفسکی، شوئیٹلن، برگساں، کانٹ اور ہیگل بے شمار ایسے فلسفیوں اور ادیبوں کو صوفی کہنے کا شوق رکھتے ہیں۔ لوئی پاسچر اور پاسکل کچھ لوگوں کے نزدیک صوفیا ہوسکتے ہیں۔ کچھ زیادہ ذہین مسخرے یاں ین کی Journal of a Thief کو بھی تصوف کی کتاب سمجھتے ہیں۔

اچھی زبان کے انداز ہوں یا زندگی کے اچھے قرینے، انسانی ہمدردی اور مسائل کے ادراک کو صوفیانہ مشرب سمجھنا بھی مغرب کے معروضی اندازِ فکر کی اپج ہے۔ انسانیت نوازی نے بنیادی ترجیح کو بہت مجروح کیا۔ فرضِ اول کی ادائیگی کے بعد یہ فرائض تمام خدا شناسی میں چلے جاتے مگر معاملات ایسے زیر وزبر ہوئے کہ انسانیت نوازی خدا سے گریز کا عذر بن گئی اور لوگوں نے اسے تصورِ خدا سے بدل لیا اور یہ دعویٰ عام ہوا کہ حقوق العباد حقوق اللہ سے فزوں تر ہیں۔ عقل جب ترجیحات کے بحران کا شکار ہوجائے تو یہی حال ہوتا ہے۔

ایک دوسرا اہم احساس کمتری مغرب سے ترسیل علم اور تحقیق کی وجہ سے پیدا ہوا۔ مدتوں سے مشرق کے اہلِ علم خوشہ چینِ مغرب رہے اور نہ صرف یہ کہ ان سے متاثر ہوئے بلکہ اپنے قدیم اثاثہ جاتِ علمیہ بھی نیلام کر بیٹھے۔ مشرق کے یہ معتبر جو جدید تعلیم سے آشنا ہوئے، دراصل مغربی انداز معاشرت کے گداگر ہی تھے۔ ان کے داخلی تجربات بھی اسی غلامانہ ذہنیت کی نذر ہوگئے اور متعدد جدید تحریکات نے جہاں کام اور تنظیم کی بناء پر مذہبی گروہوں کی بنیاد رکھی' وہاں مذہب کی اعلیٰ ترین قدرِ فکر کی مخالفت اور توہین بھی ضروری سمجھی۔ طریقت اور شریعت کے مخالف قطبین اس طرزِ فکر کی وجہ سے ہیں۔ جن لوگوں نے مذہب کی بناء پر مغربی افکار کی مخالفت کی' ان کے پاس کوئی موزوں دلیل نہیں تھی۔ مدتوں

بے عقل اور بے بصر مذہبی تقلید نے ان میں زمانی Adjustment بالکل ختم کر دی تھی۔ وہ اگرچہ مخالفت کر رہے تھے۔ مگر لگتا ایسے تھا کہ جیسے فکرِ جدید سے خوفزدہ لرزاں و ترساں ایسے حقیر فقیر کی طرح ہیں جو خیرات نہ ملنے کی وجہ سے کسی رئیس کو کوس رہا ہو۔

ایک طرف برصغیر کے ترقی پسند دانشور، مفکر اور ادیب جن کے لیے یہ نام غلط انتساب ہیں، وہ محض بندروں کی طرح مغربی افکار کی تقلید میں بغیر تجزیہ اور تجربات کے دُزدِیدہ جام چاٹ کر اپنے نفس کو تعظیم دے رہے تھے۔

بدلتے زمانوں میں اقدار سلامت نہیں رہتیں مگر اتنی بے ہنگم زمانی تبدیلی (Transition) تو کہیں بھی نہیں ہوئی جتنی برصغیر میں ہوئی۔ یہاں تہذیبِ جدید کے موافقین بھی غلام تھے اور مخالفین بھی غلام۔ فلسفی اور ادیب بھی دست نگر تو مذہبی شیوخ بھی کاسہ لیس۔

مقتدر ناموں کی فہرست چھوٹے بونوں پہ چسپاں ہو گئی۔ ملائیت، صوفیت اور لادینیت تینوں ہی مجددیت کے دعویدار ہوئے۔ اور یہ وہ وقت ہے کہ خوابِ عظمت کے مارے ہوئے یہ بیمار اُمتِ مسلمہ کے امراء اور شرفاء ٹھہرے۔ ترجیحات کچھ اس طرح بدل گئیں کہ مذہب اپنا کائناتی تشخص کھو بیٹھا۔ ایسے لگتا تھا کہ مذہب اپنی تصدیق کے لیے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کا محتاج ہے۔ تعلیمِ مغرب سے شناسائی علم کا تو نہیں، نسلی افتخار کی طرح نفسی وجاہت کا سبب بن گئی۔ بعض اوقات تو ایک مغربی مفکر کا قول الہام کا رتبہ رکھتا تھا۔

مذہب میں اگر آپ مراقباتی مدارس دیکھیں تو ترسیل خیال ٹیلی پیتھی (Telepathy)، ٹیلی کائناسس (Telekinesis)، کلیروائنس (Clairvoyance) اور روحی پرواز (Levitates) کے مظاہرات عین تصوف سمجھے گئے اور نقشبندیہ بزرگوں نے تو کمال کر دیا۔ ترکیب حضوری و وصولی اور جانے کیا کیا اصطلاحات خدا کے رستے کا نشان سمجھی گئیں۔ روشنی کے سات رنگوں پر استوار صوفیانہ مسالک کو یہ بھی علم نہ تھا کہ روشنی کے دو رنگ اور بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ خواب عظمت کا یہ عالم تھا کہ ٹرائی پاس (Tripas) کا ایک فاضل جو اپنے شعبے میں شاید وٹ گن شائن اور رسل سے بھی بڑا امام ہوتا، سیاست اور انقلاب کا مدعی ہوا اور عمر دیوانگی شعور میں گذار دی۔

سائنسی توجیہات سے متاثر چند ذہین لوگ قرآنی آیات کی من مانی توضیحات پر مُصر رہے اور قرآن مغربی افکار کا چربہ محسوس ہونے لگا۔

نیت کا تو علم اللہ ہی جانتا ہے مگر احمدی، پرویزی، اور برق جیسے گرفتارانِ زلف مغرب مذہب میں معروضی ہونے کی کوشش میں سادہ اور واضح تفسیرات سے بہت دور چلے گئے اور قرآن بجائے کتابِ تخلیق کے انیسویں اور بیسویں صدی کے مجہول اور مفتون مفکر کی تخلیق نظر آنے لگا۔ امتِ مسلمہ میں یہ خود ساختہ محقق امت کو تاویلات کے ایسے بحران میں ڈال گئے کہ سمجھنے سے نا سمجھنا بہتر ٹھہرا۔

دوسری طرف مذہب کا کلاسیکل مفکر تبع تابعین کے بعد کے فکری دور سے آگے

بڑھنے سے قاصر رہا۔ ابن عباس کا یہ قول بھلا دیا گیا: القرآن یفسرہ الزمان کہ ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس تمام علم گروہی بزرگوں کے انتخاب پر قائم ہو گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تفاسیر ناقابلِ تنسیخ بن گئیں اور عصرِ جدید سے ان کی مطابقت نہ ہوسکی۔ تاریخِ عالم میں اسلام کبھی شدتِ رجحانات کا مذہب نہیں رہا مگر جب مذہب گروہی، مدرسیاتی اور انفرادی وجاہتوں کا سبب بن گیا تو ایک نئی تفسیرِ مذہب سامنے آئی جس میں برداشت، رواداری، توکل اور اخلاص ناپید ہوگئے۔

مذہب اعتدال اور تہذیبِ نفس کی بجائے محرومیوں اور کمتری کے احساس کا مظہر ٹھہرا۔ آپس کی غلطیاں تو قابلِ برداشت تھیں مگر افسوس اور آزردگی کا باعث یہ ہوا کہ یہ تازہ تفسیرِ مذہب اغیار کی نظروں میں معتبر ٹھہری اور اسی تصور اسلام کو بنیاد بنا کر مغرب کے زاغ وزغن آزادیِ انسان اور حریتِ فکر کے مدعی بن بیٹھے۔ تمام تر تنقید کا رخ اسلام کی بجائے اسلام کی مروجہ وضاحتوں کی طرف کر دیا گیا۔ اسلام کی شناخت مسلمانوں کے کردار سے ہونے لگی۔ بدقسمتی سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کا نفاق واضح، ان کی فکری صلاحیتیں مفقود اور ان کا کردار کسی صورت بھی اس نئے چیلنج کو قبول کرنے کے قابل نہ تھا۔ اہل مغرب کی شروع کی عادت تھی اور ہے کہ وہ کمزور پر رحم نہیں کرتے۔ ان کی حیلہ جو طبیعت نے سازگار اوقات میں امتِ مسلمہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چنگیز و ہلاکو کی داستان تازہ کر دی اور اہل اسلام کو اب تک خبر نہیں کہ ان کی دعا غیر مقبول کیوں اور ان کی سعی غیر مشکور کیوں۔ اعمال کی کثرت وشدت کے باوجود فتح نصرت دور اور تائیدِ پروردگار ناپید ہوگئی۔

حکمران سیکولر اور جدید، ملا قدیم اور فکری صلاحیتوں سے عاری، عمومی مسلمان

بے چارگی میں پھر کسی مسیحا کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے پر یقین رکھتا ہے مگر یہ وعدہ جس کردار کا متقاضی ہے، وہ امید، خواہش اور آرزو کے سوا کچھ نہیں۔

اہل مغرب کی سفیدی اور سفا کی اہل مشرق کے متلون رنگوں کے لیے عذاب بن گئی۔ ان کی درس گاہوں میں مشرق کے ذہین اور متجسس ذہن تعلیم کے ساتھ ان کے کلچر اور معاشرتی برتری کا احساس لے کر لوٹے۔ اب تقسیم کا معیار بدل گیا۔ نسلی تفاخرات کی بجائے لسانی اور تعلیمی معیارات سے معاشرہ ترتیب پانے لگا۔ سیکولر مزاج نے جو کلچرل برتری کا حاصل تھا' جان بوجھ کر پسماندہ مشرقیوں میں غربت اور احساسِ کمتری کو رواج دیا۔ تعلیمی نظام مختلف طبقاتی تقسیم کا باعث بن گیا۔ مہذب ہونے کی اس کوشش میں مسلمان معاشرہ مضحکہ خیز لگنے لگا۔ ہر گلی ہر کوچہ اس تعلیمی تقسیم کا مظہر بن گیا۔ یتیم و یسیر طبقہ کے روزگار کا واحد طریقہ بن گیا۔ جس مذہب کی بنیاد دوست نگری پر رکھی جائے' ان میں عاملِ قرآن کہاں سے نکلیں گے۔ مذہبی متعلّم ترس و ترحم کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور خیرات دینے والے سیکولر تہذیب کے فراخ دست اور فیاض امراء ہے

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اقبالؔ بہت رویا مگر بات آنسو بہانے سے آگے جا چکی تھی۔ وہ امتِ مسلمہ کا بحران

تو حل نہ کر سکا مگر قائداعظم کے ساتھ مل کر برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسے ملک کی تشکیل میں مدد دے گیا جہاں کم از کم مسلمانوں کو عملی احساس کمتری سے تو نجات مل گئی، مگر جہاں تک ذہنی مفلسی کا عالم تھا، وہ آزادی کے بعد اور بڑھ گیا۔ صدیوں کے بعد حریتِ فکر و عمل کے یہ دو مدعی علم و کردار کی نئی جہت روشن کر گئے۔ مگر ذہنی ابتری کا وہی عالم رہا۔ غلامانہ ذہنیتوں کا فسوں کارگر رہا اور بجائے امت مسلمہ کا ہمہ گیر تصور ابھرنے کے مذہب اور تقسیم ہوا۔ مسلمان مزید بکھر گئے۔ مجبوری اور محکومی اور بڑھ گئی۔ 70 سال کے بعد بھی مملکت خداداد پاکستان نوزائیدگی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسلام اپنے گھر آ کر بھی جلا وطن ٹھہرا۔ Tin Packed مذہب نے اس عظیم شعوری تحریک سے جدائی اختیار کر لی جس کی دعوت محمد رسول اللہؐ نے پندرہ سو برس پہلے اجہل ترین انسانوں کو دی۔ استادِ عالی مقام کی استقامت اور تائید ایزدی سے جو اسلام محبوبِ خلائق بھی ہے اور مسجودِ ملائک بھی، دورِ حاضر میں اپنی ترجیحات سے محروم ہو گیا۔

آدمؑ سے محمد ﷺ تک مذہب کو شرائع کی تبدیلی کے ساتھ مختلف اقوام میں رائج ہوا مگر اس کی بنیادی اور اولیں ترجیح صرف اللہ تھا اور ہے۔

شرع تو معاشرہ کی محفوظ چاردیواری ہے تا کہ لوگ معاشرتی، معاشی اور اخلاقی تحفظات میں مذہب کی اصل غرض و غایت تک پہنچیں۔ شرع تو دنیا کے دوسرے نظامات کے مقابلے میں ایک خدائی نظام جو عدل و انصاف، معاشی تحفظ اور اخلاقی اوصاف پیدا کر کے اگر تمام لوگوں کو نہیں تو کچھ کو ضروری نظریاتی مقاصد عطا کرتی ہے، جس میں محکوم اور

حاکم کوئی اختیارات سے تجاوز نہیں کرتا۔ شرع زندگی کے ہر شعبہ میں مداخلت کرنے کے ساتھ ساتھ کم سے کم مزاحمتی (Least Friction) ادارے تخلیق کرتی ہے جو انسانوں کے اندر طبقاتی اخلاقیات کے باوجود انہیں عزتِ نفس کا یکساں مقام عطا کرتی ہے۔ اس عزتِ نفس کا تعین دنیاوی مال و اسباب یا اقتدار کے درجات سے نہیں بلکہ یکساں بندگی پروردگار سے ہے۔

ہر نظام اپنے تمام تر شعبہ جاتی تعرفات سے مکمل ہوتا ہے۔ کوئی بھی نظام' چاہے سوشلزم، کمیونزم ہو یا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام' اپنے اندر کسی دوسرے نظام کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتا مگر ہماری اپنی بے چارگی کا یہ عالم ہے کہ ہم اسلام کے بیشتر اہم ترین نظام معطل کر کے معدودے چند ذاتی اعمال تک محدود کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم مسلمان نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود ہم اللہ کی حاکمیتِ کلّی پر اعتبار نہیں رکھتے اور اس کے بنائے ہوئے معیارات کو دورِ حاضر میں پسماندہ خیال کرتے ہیں۔ شرع وہ ابتدا ہے جس سے ہمیں اپنے اعمال پرکھنے کا موقع ملتا ہے جس کی ظاہری ترتیب کے بعد ہم مذہب کی اصلی اور اہم ترین ترجیح کو پلٹتے ہیں اور وہ ہر انسان کا خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ داخلی اور ذاتی تعلق ہے۔ مذہب خدا کے لیے اور مذہبی نظام لوگوں کے لیے۔ مذہبی نظام اللہ کا لوگوں پر صدقہ ہے۔ معاشرہ اللہ کے دیئے ہوئے نظام سے بتدریج ترقی پذیر ہو کر صلاحیتِ عرفان پر پہنچ سکتا ہے۔

مسلمان معاشرہ کے سائنسدان، فلسفی، ادیب اور دانشوری ترجیحِ اول کا ادراک

کر سکتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے معاشرے میں یہ ترجیح مفقود نظر آتی ہے تو وجہ بھی ظاہر ہے۔ ان کے نظام اس اہلیت سے عاری ہیں کہ خدا کا حقیقی شعور اجاگر کر سکیں یا کسی کے دل میں اس عالمگیر انس و محبت کی شمع روشن کر سکیں جو کسی بندہ خدا کو احسن تقویم ٹھہرائے جس کی وجہ سے دعائیں قبول ہوں، بارشیں برسیں، زمین پوشیدہ خزانوں کو اجاگر کرے، نیابت اللہ کا حق ادا ہو، جنت میراثِ مومن ہو، شرع شروعات ہے اور مقصود و مطلوب۔ اب اگر ترجیحات کے یقین میں فرق پڑ جائے اور لوگ اپنی چند روزہ عبادات و اشغال ہی کو مطمح نظر بنالیں تو اصل مقصد دور چلا جاتا ہے۔ کس لیے جیتے ہیں، ہم کس کے لیے جیتے ہیں۔ یقیناً شرع کے لیے نہیں۔ بھلا راستہ کب منزل بن سکتا ہے۔ کیا تمام مذاہب متحارب نظریات کے درمیان نہیں پیدا ہوئے۔

مذہب جب محض رسم و رواج رہ گیا، خدا کی طرف جانے کی بجائے وہ ذاتی اور سماجی شہوات کا شکار ہو گیا تو ترجیح اول کے نسیان کے ساتھ ہر مذہب علمائے مذہب کے کم تر تعصبات کا شکار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ تعصبات سنگ و خشت کے اصنام سے بھی زیادہ سخت اور مکروہ ہو گئے۔ اتنے کہ پیرانِ قدس کے آنسو بھی انہیں نرم نہ کر سکے اور عذاب کے سوا زمین صاف کرنے کا کوئی چارہ نہ رہا۔ اللہ نے انسان کو معمولی منفعت کا سودا نہ دیا تھا۔ کہاں ستر یا سو سال کی زندگی اور کہاں ارب ہا ارب کی خلافت جنت۔

کہاں گئی عقل انسان کی حقیقت پسندی اور معروضیت؟ لعد اد و شمار کے پجاری حواسِ خمسہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ عقل تو پھر حواسِ خمسہ سے کچھ آگے ہی ہے۔ یہ اپنی بنائی

ہوئی ایجادات سے مسحور "عشق نا پید و خرد می گزدش صورتِ مار"۔

نشہ استکبار ہمیں شیطان کے نسلی تفاخر کے مقابل تو لا سکتا ہے مگر چشمۂ رحمتِ پروردگار کے مضافات میں بھی اترنے نہیں دیتا۔ قبر تک کی مہلت قبر تک رائیگاں گئی۔ سوائے اس کے ایک بہت بڑی چادرِ غفلت و نسیاں نے ان کی عقول کو ڈھانپ لیا ہو اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور یہی حقیقی مطلب ہے اس قرآنی آیت کا کہ اللہ ان کے دلوں میں اور قبولِ حق میں اوٹ بن جاتا ہے۔ مگر کیوں؟ کیا اللہ نہ چاہے گا کہ ذہین، فطین اور محنت کش لوگ اس کی طرف مائل ہوں، اقرار وحدانیت کریں، بندگی کے منصب پر پورے اتریں۔ اس کا جواب شاید تاریخ یہود و نصاریٰ میں ہے۔ تیس صدیوں کی معلومہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے عقل و ذہانت کو جبلی خواہشات کا غلام بنائے رکھا۔ حرمت تصورِ خدا کی توہین کی۔ بت تو نہیں مگر آپ خدا کے شریک بن بیٹھے۔ اس کے رشتہ دار اور اقارب تخلیق کیے۔ اس کی اولاد بنائی۔ اس کی نسل کا اجراء کیا۔ خطاؤں کی پردہ پوشی کی بجائے ان کے اشتہار دیئے۔ مکر و فریب کے تار و پود بکھیرے۔ خدا کی جان بوجھ کر تحقیر کی اور اپنے آپ کو معزز تر کیا۔ اگر جینیاتی تعلق موثر ہیں تو زمان و مکاں کی تبدیلی زیادہ موثر نہیں نکلی۔ دورِ حاضر میں شریعتِ پیمبر کا مذاق اور اپنی عقلیت پرستی کا معیار ٹھہرایا۔ قومِ عاد و ثمود کی روش کا اعادہ کیا۔ خود شناسی کی بجائے تمرد و سرکشی اور خود غرضانہ نام و نمود کی حوصلہ افزائی کی۔ حرام کو حلال کرنے میں جس دیدہ دلیری سے کام لیا۔ وہ انہی کی تاریخ کا تاریک باب ہے۔ شیطانی یقین کی رنگ و نسل پر ذہنی برتری کی بنیاد رکھی۔ مکر و فریب اور ریا کاری کے انداز کی بنیاد چانکیہ اور میکیاولی کا فلسفۂ سیاست تھا۔ ظلم و ستم میں صحرائے گوبی کے خونخوار منگولوں

سے بھی بازی لے گئے۔ مقاصد برآری کے لیے بھیڑیوں کے غول بن گے اور معصومیت کا یہ عالم کہ اپنے آپ کو دنیا کی تہذیب یافتہ اور متمدن قوموں میں شمار کیا۔ وقت نے بتایا ہے کہ مغرب کے مہذب اور شائستہ رویوں کے پیچھے انتہائی ابتدائی جنگل کا جانور ہمیشہ موجود رہا۔ علم وادب کے تمام نقاب بھی اس تعصب اور سفاکیت کو نہ چھپا سکے جو صدیوں سے ان کے اذہان کی بنیاد ہے۔

آزادیٔ رائے اور تحفظِ حقوق کی صدیوں کی جھوٹی روایات دورانِ زمانہ کے ملبے میں دب گئیں اور پھر وہی چہرہ، وہی عادت، وہی اندازِ جاہلانہ اور عاداتِ عاجلانہ، دوہرے قانون، دوہرے نظام، دوہری شخصیتیں، دوہرے چہرے۔ اصل خودغرضانہ واحمقانہ۔ مختصر وقفے میں تاریخ اپنے اعمال دہراتی ہے۔ جرمنی کو قتل یہود کے احساسِ جرم کی سزا اب بھی مل رہی ہے مگر ہیروشیما اور ناگاساکی کے قاتل آزاد۔ مکروفریب آشکار ہونے کے باوجود مغربی فکر کے سرکردہ حکمران دانشور طاقت اور انصاف کو ہم معنی قرار دے رہے ہیں۔ طاقت صحائفِ حکمت و انصاف لکھ رہی ہے۔ مظلوم اسے جبرِ تقدیر سمجھ رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بات اب زمین کی حکومت سے آگے بڑھ گئی۔ بات اب خدائی کی ہے۔ یک حکومتی تصور اب اقوام متحدہ کے باہمی اشتراکی تصور سے آگے بڑھ گیا ہے۔ زمین کے خدائے واحد کا نظریہ قائم ہونے کو ہے مگر اس خدا کا وجود رحم وکرم پر نہیں بلکہ طاقت اور کثرتِ اسباب پر ہے۔ کوشش یہ ہے کہ پیغمبرانہ تعلیمات اور اوصاف عبادت واخلاق کو مکروفریب کی روایات کے ساتھ مسخ کیا جائے۔ آسمانوں کی حکومت کو زمین کی امارت سے بدل دیا جائے۔ یہی تو دجل ہے۔ یہ کفر سے بڑی تکفیر ہے۔ خدا کا انکار بجا مگر نمرود وہامان کی طرح

خدا سے جنگ کا عزم ہی تو دجال کا وطیرہ ہے۔ ربوبیت کی نئی تاریخ اہلِ تسلیم کے لیے وظائف اور افراطِ رزق اور انکار کرنے والے کے لیے آگ اور کشت وخون۔ ہزارہا سال کی سہل پسندی، تین صدیوں کی مسافت میں انسان پہیے اور بارود تک پہنچا مگر ایک صدی میں انسان قتل وغارت کے مہیب آلات بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ذہن کی یہ سرعت پذیری معتدل تو نہیں، قوت وعظمت کا شزوفرینیا (Schizophrenia) اعتدال کی حدوں سے گذر چکا ہے۔ اب اس قافلۂ سالار کو کوئی حادثہ، کوئی بڑا دھماکہ، قیامت سا کوئی سانحہ ہی معتدل کر سکتا ہے۔ اس امکان کی قربت سے دلِ انسان لرزاں اور ترساں ہے، مگر وہ جسے سوچنا چاہیے۔ انسان افتاں وخیزاں اپنی منزلِ ہلاکت کو رواں ہے۔

لوگ شاید بغیر ضرورت خدا کا احساس نہیں رکھنا چاہتے۔ شاید جان بوجھ کر ہم اس حقیقت کو پسِ خیال ڈال دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ خیالِ خدا ہمیں ہر معاملے میں ایک ایسی پابندی سے آشنا کرتا ہے جو کم از کم نفسِ انسان کو تو گوارا نہیں۔ ایک صاحب نے مجھے کہا کہ چالیس برس کا تو میں ہو گیا ہوں۔ مجھے ابھی تک تو خدا کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔ مجھے کیا پڑی ہے، اس کے بارے میں سوچنے کی۔ آپ یقین جانیے کہ مجھے وہ خوش نصیب نہیں لگا اور نہ اچھے مذاق ہی کا مالک لگا۔ مجھے لگا کہ اگر حماقت کا کوئی جسم ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔

کچھ حضرات ناک بھوں چڑھائے رکھتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ یہ خدا سے معذرت نکلوانا چاہتے ہیں اپنی تخلیق پر۔ ویسے بعض اوقات اللہ پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ خالق کی یہ بلندی اور تخلیق کی یہ پستی۔

تعلیمی اداروں میں بحران ذرا مختلف ہوتا ہے۔ بے وقوف عورتیں فکرِ جدید کے تاثرات سمیٹے ہوئے باغیانہ مزاج کے ذہین لڑکوں اور استادوں کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جان ڈن (John Donne) کی طرح مابعد الطبیعیات کے مباحث

جہاں ایک طرف نفسیاتی ترفع اور برتری کا باعث بنتے ہیں' وہاں ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے جنسی ہارموز تقریب ملاقات کا باعث بھی بنتے ہیں۔ علم کے ہر شعبے میں ملائیت اور لادینیت کے علماء آپس میں برسر پیکار ہوتے ہیں۔ سازش' مکروفریب' شکایت' غیبت ہر دو اطراف کا محبوب مشغلہ ہے۔ اداس جوان نسلیں ملائیت کا ساتھ دیتی ہیں اور فراخ اور آسان نوجوان لادینیت کا ساتھ دیتے ہیں۔

حیرت کی بات دیکھئے کہ پاکستان میں ”ایشیا سبز بھی ہوا اور ایشیا سرخ بھی ہوا“ مگر دونوں رنگوں کا ایشیا اور کم از کم پاکستان پر کوئی اثر نہ ہوا' البتہ اخلاقیات ضرور بدل گئیں۔ سوشلزم اور کمیونزم نے صرف اخلاقی Dogma کے اس حصہ پر حملہ کیا جس کا تعلق عورت اور مرد کے تعلقات کی اکائی سے تھا۔ آزادانہ ملاقات، پرانے سماجی ماحول سے رہائی، حیا اور پردہ سے بغاوت' کسی نہ کسی سطح پر جسمانی نمائش کی حوصلہ افزائی، مرد و عورت کی برابری کا تصور، رومانوی ترغیبات اور گاہے گاہے ایک دو پسند کی شادیاں اس پورے ڈرامہ کا انجام ہوتا۔ مغربی انداز فکر اور کلچر سے متاثر چند مادر پدر آزاد اساتذہ نے جدید جنسی رویوں کی تشہیر کو فرض جانا۔ ملائیت کے حجروں کی طرح ان آزاد منش استادوں کی ذاتی نشست گاہیں بھی ہنسی مذاق' ڈھول ڈھپا اور جنسی چہلوں کا شغل بن جاتی ہیں۔ ان اساتذہ نے تحقیق اور جستجو کے میدان میں سوائے Ph.D کے تھیسس کے کبھی اور کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ان کا اثاثۂ زندگی یورپ کی درسگاہوں کے وہ تاثرات ہیں جن میں کوئی نہ کوئی احساس کمتری ضرور نظر آتا ہے۔ یہ حضرات تعلیم سے کم متاثر نظر آتے ہیں' طرز حیات مغرب کے زیادہ اسیر ہوتے ہیں۔ یہ علم سیکھنے کے نااہل ہوتے ہیں۔ آپ خود سوچئے کہ جس کو اتنا بھی پتہ نہ

ہو کہ میں نے یہ علم سیکھ کر کہاں استعمال کرنا ہے' وہ کیسا طالب علم ہو سکتا ہے۔

بہت کم کسی مضمون میں ہمارے یہ عظیم مغرب نواز اساتذہ کسی تحقیق میں اضافہ کے قابل ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے نام سے کئی شادی گھروں، بیوٹی پارلروں اور پبلک تفریح گاہوں کا افتتاح ہو سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ جاتے ہوئے یہ **ملائیت** کے Status پر قائم ہوتے ہیں۔ واپسی پر یہ **لادینیت** کا لبادہ لیے ہوتے ہیں۔ **حیرت کی بات** یہ ہے کہ انگریزی زبان اور امریکی محاورہ گفتگو اس کلاس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور سب سے بڑی **حیرت کا باعث** یہ ہے کہ تعلیم اگر اردو یا کسی علاقائی زبان میں دیں تو وہی قدیم **ملا** لگتے ہیں۔ تعلیمی ادارے تعلیمی اقدار کی بجائے حکومتی اشارات کے محتاج ہیں۔ کوئی بھی سربراہ عموماً اس احتیاط سے چنا جاتا ہے کہ وہ کوئی آزادانہ رائے کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ Think Tank دراصل خوشامدیت اور جی حضوریت کے اجتماع ہوتے ہیں' جنہوں نے ہر حال میں وقت کے حکمران کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور عام اعداد و شمار ان کے ہاتھوں مسخ ہو جاتے ہیں۔ اہل اسلام کی تمام تر زبانیں اپنے حکومتوں کے اقتدار کی قصیدہ گو رہتی ہیں۔ مذہبی محکمہ اور وزارتوں کے حصول کے لیے علمائے مذہب خدا سے بھی **بغاوت** کر سکتے ہیں' فتوے بدل سکتے ہیں' شریعت میں تحریف ہو سکتی ہے' حدود اللہ کی تنسیخ ہو سکتی ہے۔ اپنے اپنے ماحول میں کبھی کبھی کسی عالم کی اچھی تقریر کی **شہرت** سننے میں آ جاتی ہے۔ کسی نئے فلمی گیت کی طرح کوئی مولوی تفریح سماعت کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔ کچھ کے بلند و بانگ لہجے عوام میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ مگر **حیرت کی بات** ہے' کوئی مولوی صفائے قلب اور کردار کی کسی خوبی کے لیے کبھی مشہور نہیں ہوا۔

نہ جاننا معمول کی بات ہے مگر جاننا سحر ہے۔ ذہن انکشافات کی دہلیز پر خیالات کے تموج میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کیفیات کو غیر معمولی سمجھتے ہوئے اپنی صفات میں اہلیت کا ناقص خیال پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندازِ زندگی میں بھی نو وارد خیالات کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ انسان اپنی ہی ترقی اور تعرج خیال کو سنبھال نہیں پاتا۔ دیکھنے میں یہ اکثر نارمل انسان درونِ ذات اپنی فکر کے جداگانہ استدلال کی زد میں ہوتے ہیں۔ وہ ہر خیال کو ذاتی اور شخصی صفت سمجھتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہر خیال اس طرح نسب وکسب کا مالک ہے جیسا کہ دنیا کی باقی اشیا۔ خیال اکیلے نہیں ہوتے۔ یہ بھی رشتوں میں منسلک ہوتے ہیں۔ ان کے بھی آبا و اجداد ہیں نسلیں ہیں اور ایک خیال کے آتے ہی اس کے خاندان کے بارے میں جاننا مشکل نہیں ہوتا۔ انسان کی عقل خیال کی آزمائش سے مشکل سے گذرتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سے بغیر خدا کی محبت اور خوف کے کوئی سلامت نہیں جاتا۔

خیالات، احساسات اور جذبات کی دنیا ئیں ظاہری سائنسز سے زیادہ پیچیدہ اور

ناقابلِ فہم ہیں۔ انسان ان کے الجھاؤ میں اپنے بیشتر تحفظات موقوف کر دیتا ہے۔ خیال خواہ عظمت کا ہو یا کمتری کا، محبت کا ہو یا نفرت کا، جرأت آرزو کا ہو یا تموج جذبہ کا' بے خطر انسانی ذہن میں اپنی جگہ بناتا ہے اور ذہن چناؤ کے عمل میں کسی احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ جاننا سحر ہے اور یہ وہ سحر ہے جس سے ہم بصد شوق مسحور ہوتے ہیں۔ اسے اپنی اعلیٰ قدر اور فضیلت جانتے ہوئے اس فخر ومباہات کا اظہار کرتے ہیں۔ ادیب جب اپنے آپ کو کسی خوبصورت جملہ یا کیفیت کا حامل دیکھتا ہے' تو از خود اس کے دامِ فریب میں الجھتا ہے اور سب سے پہلے تو اپنے آپ کو عجیب اور تنہا سمجھ کر نازاں ہوتا ہے۔

خیالات کا یہ عُجب اسے عمومی زندگی سے علیحدہ کر دیتا ہے اور وہ اعتدال فکر وخیال کو عمومی رویہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ شعراء، ادبا اور فنکاروں کی زندگی میں اعتدال ناپسندیدہ مزاج سمجھا جاتا ہے۔ یہ رویہ ایسے غیر معقول اور غیر عملی رجحانات کو جنم دیتا ہے' جو فطری قوانین سے انحراف کا باعث بنتے ہیں۔ باقی لوگ بھی چونکہ اس قسم کے غیر معمولی اثرات کی خواہش رکھتے ہیں' اس لیے یہ عمومی لوگ ان کو نابغہ اور جینیس سمجھتے ہوئے ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ عموماً اس جرأت رندانہ کی زد میں وہ قوانین آتے ہیں' جنہوں نے زمانہ غار سے لے کر آج کے متمدن معاشرے تک انسان کی بقا میں مددودی ہوتی ہے۔ انارکی تصور کی غیر ترتیب یافتہ شکل ہے۔ یہ ترجیحات کی تردید ہے اور مجموعی زندگی کو انفرادی تاثرات سے بدلنے کی کوشش ہے۔ تحریر وتقریر کی آزادی کا تصور بھی اسی بہیمانہ انارکی کا ایک حصہ ہے۔ پیغمبرانہ اخلاق اور ذہانت ہی اس آسیب سے نجات یافتہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہر پیغمبر اپنے زمانہ کی بہترین عقل کا وارث ہوتا ہے۔

پیغمبر اس قسم کے شخصی عقلی انحراف کے نتائج سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں‘ جیسے کوئی کتاب اللہ میں تحریف کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح ذہین انسانوں کا یہ طلسم آئینہ بند گروہ انسانی خیالات کی مکمل تحریف کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عقل انسان نے نسل انسان کو کوئی اخلاقی نظام نہیں بخشا‘ بلکہ اخلاقی نظام میں تنقیص کا جرثومہ پھیلانے والے یہ لوگ آزادی اور حرمت کے نام پر بدترین اخلاقی جرائم کے بانی ہوجاتے ہیں۔ مہذب بننے کی خواہش بجا ہی لیکن اگر تہذیب کی مراجعت دیکھی جائے تو محسوس ہوتا ہے‘ یہ عام مفکر انہی برباد شدہ نسلوں کے علمی وارث ہوتے ہیں جن کی وجہ سے زمین میں کثرت سے آثار قدیمہ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ لوگ باقی رہنا چاہتے ہیں‘ نام زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ تا ابد دنیا انہیں یاد رکھے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ بابل کے کھنڈرات‘ پومپائی کی ہلاکت زدہ زمین، موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کے ادیب کیوں نہ زندہ رہے۔ کیا یہ معاشرے ان ادیبوں اور مفکروں سے خالی ہوں گے۔ افسوس کہ کسی شاعر کی بیاض اور کسی ادیب کا مقالہ اور کسی فلسفی وقت کا نام اور کلام ان اندھی بستیوں‘ ٹوٹے ہوئے مکانوں، اجڑے ہوئے محلات اور سوکھے ہوئے کنوؤں سے نہیں نکلا۔

مگر آج کا انسان بھی کچھ بہتر نہیں۔ وہ تباہیوں کے اس پس منظر سے درس عبرت سیکھنے کی بجائے ان آثار قدیمہ سے صرف میوزیم اور ڈرائنگ روم سجانے کا کام لیتا ہے۔ صحت اور اعتدالِ عقل کے وارث پیغمبروں کا استہزا کوئی نئی بات نہیں۔ طنز و تشنیع‘ جور و ستم اور مکر و فریب کی روایات سے ہر پیغمبر اور رسول کا واسطہ پڑا۔ کچھ کو جہالت کے ان علماء نے

تہ تیغ بھی کیا۔ کچھ کو سولی پر چڑھانے کی بھی کوشش کی۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ بجائے یحیٰؑ کے تزکیہ اور صبر کی داد دینے کے سلوی کے نخش اعمال کو باعث ترجیح سمجھا گیا۔ انسان نے آج تک شاید ٹریفک لاء کے قانون کے کوئی سہولت انسان کو نہیں بخشی۔ نہ صرف یہ کہ اس مسحور عقل نے انسان کے واحد طریق نجات کو چھینا اور ایک بے صبر' بے بصیرت اور بے آبرو معاشرہ کی بنیاد رکھی بلکہ اپنی خود غرضانہ اور جبلی تحریکات کی بدولت انسانی معاشرہ سے یادداشت، نیند، امن وسکون اور قرار قلب بھی چھین لیا۔ خیال و ایجاد کی تحریکات نے ترجیح اول کو ایسے بھلایا کہ پوری نسلِ انسان عالم سکرات میں لگتی ہے جس کو اب یہ یاد نہیں کہ کوئی کھوئی ہوئی منزل اب بھی اس کے انتظار میں ہے۔

اعداد و شمار کی اس بے بصر کائنات میں تمام عقلی توضیحات جبرِ مسلسل کی طرح نسلِ انسان پر مسلط ہیں۔ یہ وہ المیہ ہے کہ جو انسان فکری رہبر خود اپنے اوپر مسلط کر رہے ہیں' مگر خدائے کائنات کا تصور دورِ حاضر کی عقلیت کا سب سے بڑا آسیب ہے۔ باوجود کوشش کے انسان اپنی عاقبت کے خوف سے لرزہ بر اندام ہے۔ موت اگر ایک بار ہوتی اور موت کے بعد کچھ نہ ہوتا تو بھی انسان آزاد ہوتا مگر آسیبِ مرگ سے تو کوئی ذی حیات آزاد نہیں اور یہ عفریت انسان کو حسرت و یاس کے بے کراں سمندر میں دھکیل رہا ہے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک جب ٹوٹی ہوئی پتوار والی کشتی کے مسافر پر پڑتی ہے تو اسے مذہب میں روشنی نظر آتی ہے ورنہ پھر وہی مہیب سمندر' وہی اتھاہ تاریکی' وہی ہولناک موجیں۔

رہِ فکر میں سب سے بڑی خطا طمانیت ہے۔ ارذل عمر تک پہنچنے سے پہلے اگر فکری سفر ختم ہو جائے اور انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھ لے تو اس سے بڑی خطا اور شاید گناہ کوئی نہیں۔ فکر دریائے رواں کی طرح ہے۔ رطب و یابس کا اس میں ملنا عین فطرت ہے اور تکمیل شاید کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ صاف شفاف پانی کا چشمہ بھی اگر رک جائے تو سڑاند کا شکار ہو جاتا ہے۔

دنیا کے تمام مقاصد فکر کو محدود کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ جزوی عقلی استعداد کہیں نہ کہیں اپنی حدود تک پہنچ جاتی ہے۔ عقل جہاں رکتی ہے، بت خانہ تعمیر کر لیتی ہے اور باقی ماندہ عمر انہی حدود و قیود میں گذارتی ہے جہاں سے بڑھنا اس کا مقدر نہیں ہوتا۔ مگر ایک راستہ یقیناً ایسا ہے جس میں عقل محدود نہیں ہوتی۔ علم و عقل تمام تر تجسس کے ساتھ ہے اور جستجوئے مزید کے بغیر ایسے بھوکے معدے کی طرح ہے جو اپنے آپ کو چاٹتا ہے۔

اگر دل کی دوا یادِ خدا ہے تو عقل کی روانی تصورِ خدا سے ہے۔ عقلِ کُل اور علم مکمل

کی تحصیل ناممکن سہی مگر اس کے قریب تر ہونے کی خواہش معراجِ دانش ہے۔ اللہ کے بغیر عقل ٹھہراؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور اس میں ایسی طمانیت پیدا ہو جاتی ہے جو محبتِ ذات پر منتج ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اللہ عقل انسان کے لیے چھوٹا وقفہ مختص کرتا ہے اور اسے ”لم“ کہتا ہے مگر تو اروے ٹھہراؤ دراصل مزید فہم و فراست کے لیے تامل ہے۔ شناخت الٰہیہ کے سوا تمام علوم کاروبارِ حیات پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کو علم کہنا بھی دراصل محال ہے۔ دنیاوی مہارتوں کے مظہر اذہان بالآخر افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اسی طمانیت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے مزید فکری گہرائی اور گیرائی تک پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

صدیوں سے انسان گناہ و ثواب کی ثنویت کا شکار ہے۔ اس کا خوف اسے بار بار کسی جابر و قاہر حکمران کی جواب دہی سے ڈراتا ہے اور ثواب اس کو اعمال میں قید کر کے اس کا ذہنی سفر روک دیتے ہیں۔ شاید یہی ایک بڑی وجہ ہے انکار خداوندی کی کہ وہ اپنے خوف سے آزادی چاہتا ہے مگر ردِ عمل کے طور پر۔ سوچنے سمجھنے کے راستے کی اذیتیں اس کے لیے مشکل اور انکار سہل ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اس انکار پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خدا سے آزاد انسانی باطن اس اہلیت کا مالک نہیں کہ کوئی مربوط حل زندگی اور کائنات کا پیش کر سکے۔ خود فراموشی خود شناسی کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ انکار کی یہ روش بھی تنہائی فکر سے خوفزدہ ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے ہم خیال انسانوں کے تقرب کا شائق ہوتا ہے جو اخلاقی اور ذہنی بحران میں صرف اپنے جیسے لوگوں سے تسلی پاتے ہیں۔

تقلید بھی نصیب کی بات ہے۔ تقلید سے پہلے کی روش اور خواہش ہی فیصلہ کرتی

ہے کہ آپ اولیائے رحمان ہونا چاہتے ہیں یا اولیائے شیطان۔ اگر کسی شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو بھی جائے تو اس اخلاقی جرأت سے تہی ہوتا ہے کہ اس کا اظہار برملا کر کے دوسرے لوگوں کو عذاب فکر سے بچا لے۔ تقلید یا تو اپنی ذہنی صلاحیتوں کا جائز ادراک ہے کہ کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اعلیٰ غور و فکر کی صلاحیتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے' ان کو رہبری کے لیے کسی نہ کسی بہتر کی جستجو ہوتی ہے یا پھر مقلد اپنے آپ کو کسی محدود طرز فکر کا اسیر کر لیتا ہے۔ یہ دوسری قسم کی تقلید بدترین تعصبات کو جنم دیتی ہے اور بعض اوقات صدیوں تک فہم و فراست کے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔ کسی بھی سکول اور مکتب خیال کی چار دیواری بھلا عقل بسیط کے امکانات کیسے سمیٹ سکتی ہے۔ مکاتب فکر اپنی فکری استعداد کی کمی پوری کرنے کے لیے تقدس اور جھوٹے دعاوی کا آسرا لیتے ہیں۔ شکل و شباہت اور رنگ و لباس کی قید نجات کا باعث سمجھی جاتی ہے۔ تقلید محض بات سمجھنا تو دور کی بات ہے' سننے کی بھی روادار نہیں۔ مذہبی اور کم فکر خیالات کے یہ گروہ تسلسل کے ساتھ مقلدین میں ذہنی ارتکازات تخلیق کرتے ہیں۔ ذہنی صفائی (Brain Washing) کا یہ عمل سادہ اور شریف لوگوں کو بھی جنونی اور متشدد بنا دیتا ہے۔ اس میں کچھ ان پیرانِ پارسا اور علمائے کم فہم کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے اختیارات کا سودا نہیں کرتے۔ مقلدین پر غلبہ صرف ایک صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ وہ مزید سوچنے کے قابل نہ رہیں اور یہ گروہ قائدین برہمن سماج کی طرح بڑی مہارت سے ان میں خوف اور ہراس کی کیفیات پیدا کر کے انہیں اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور یہ طریقہ کار نسلوں تک محیط ہوتا ہے۔ تمام مذہب مرشد گرامی اور استاد مدرسہ کے خیالات تک محدود ہوتا ہے۔ ان مدارس سے باہر ایک کائنات کفر آباد ہوتی ہے جس کا خوف ہر مقلد کے ذہن و دل پر سوار رہتا ہے۔

شہادت اب خدا کے لیے نہیں بلکہ مدرسہ کے سنگ وخشت کے لیے ہوتی ہے۔ مذہب تو کوئی بھی جنوں خیز نہیں۔ بھلا اعتدال کی تلقین تشدد پر کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ ﷺ تک کوئی بھی پیغمبرِ خدا نہ متشدد تھا نہ کم فہم بلکہ تمام انبیاء نے اپنے معاشرتی جبر واستبداد کا سامنا کیا اور لوگوں کی عقول کو رسم ورواج کی قید سے آزاد کیا۔ پھر کسی بھی نبی نے تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی عقلِ کُل کے یہ رسول تو لوگوں کو اختیار دینے آئے تھے' جہالتوں کی افسردگی ان کے مناصب سے بہت دور تھی۔ مذاہب جب روشِ اعتدال سے گذر گئے تو کم تر اذہان نے انہیں کائناتی فہم وفراست سے جدا کر کے قبائلی تعصبات اور ذاتی وجاہتوں کا قیدی بنا لیا۔ ہر قوم نے اپنے مذہب کو صرف اپنا سمجھا تو دوسروں کو ذاتی اور مذہبی حریف۔ اہل یہود نے مذہب میں جس خود غرضی اور تعصب کا مظاہرہ کیا' وہ پھر عیسائیت میں نفوذ پا گئی اور اس سے بڑا نقصان اسلام کی عالمگیریت کو پہنچا۔ اسلام بھی پھر اپنے متعصب اور کم فہم علماء سے جانا جانے لگا۔ اسلام کے یہ داعی اسلام کے سب سے بڑے دشمن نکلے۔ قرآن کی بجائے ان علمائے ظاہر کے خیالات ہی جملہ اسلام سمجھے گئے۔ اس طرح ایک انتہائی غلط روایات کی بنیاد پڑی' جو اب تک جاری ہے۔

سائنس کے برعکس جہاں ہر صاحبِ فکر نے دوسرے کا احترام کیا اور تحقیق وجستجو کو آگے بڑھایا' مذہب کے داعیوں نے اپنے اپنے مذہب کو جدا کر لیا اور دوسرے مذاہب کو اپنا حریف جانا۔ کائنات کے سب سے بڑے کائناتی پیغام کو بے عقل اور بے اخلاق لوگوں

نے جنگ وجدل کا ذریعہ بنا کر اپنے اقتدار و اختیار کے راستے ہموار کیے۔ سائنس آگے بڑھ گئی اور مذہب گھروندوں میں بٹ کر رہ گیا۔ یہود نے عیسیٰ و محمد ﷺ کی نبوت سے انکار کیا۔ عیسائیت نے اسلام کا انکار کیا اور اہل اسلام دونوں کے مغضوب ٹھہرے۔ اب اللہ ہر روز تو پیغمبر تخلیق کرنے والا نہیں تھا۔ سوائے عقل کے کوئی شے باقی نہ بچی جو انفرادی سطح پر اس بحران مذاہب سے نکل کر حقیقت جان سکتی اور خدائے واحد کے پیغام کو قبول کر سکتی۔ سوچنے والوں نے اس بحران کا ایک حل یہ نکالا کہ بنیادی سوال سے انحراف کیا۔ مقصد حیات کو پس پشت ڈال دیا اور زندگی کو دنیاوی مقاصد تک محدود کر لیا۔ ایک غلطی تو اہل مذاہب سے ہوئی اور اس سے بڑی خطا دانشمندانِ دنیا سے ہو گئی۔ کیا کوئی سائنسی حقیقت بھی اس بحران کا شکار ہوئی۔ کیا کسی سائنس دان کے ذاتی عمل سے بھی کوئی فارمولا یا کوئی تناسبِ اجزا بدلا۔ نہیں، مگر مذہب کچھ لوگوں کی ذاتی آراء کی وجہ سے اپنی ہیئت تبدیل کر گیا اور لوگ اللہ کو ماننے اور پوجنے کی بجائے ان علماء کے آستینوں کے بتوں کی دہلیز پر جبیں ریز ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے بڑی ہمت کی۔ قرآن کی آیات کو بغیر سیاق وسباق نقل کر کے اس میں تضاد کی نشان دہی کی۔ تضاد بڑے مضحکہ خیز تھے۔ کسی آیت میں اللہ نے نرمی دکھائی اور کسی میں قہر وجلال۔ بھلا ان سے پوچھئے کہ کسی انسان میں رحم وکرم کی صفات کے ساتھ غصہ کا ہونا اس کا تضاد ہوگا۔ کیا محنت اور استقامت کی شدت کے بعد آرام کرنا متضاد صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ کیا انسانوں کو رحم وکرم کے ساتھ ان کے سمجھانے کے لیے نار دوزخ کا ذکر خدا کے رحم وکرم میں نقص پیدا کرے گا۔ کیا ترتیبی مراحل میں تمام کام بغیر مشقت کے طے ہوتے ہیں۔ ان مفکرین نے اپنی عقل وفراست کا جائزہ کیوں نہیں لیا۔ یہ کیوں نہ جانا کہ یہ کتاب حکیم کے فہم کے معیار تک ابھی نہیں پہنچے۔ کیا Ph.D. کی کتاب پانچویں کے متعلّم کے ہاتھ دے دینے سے عقلی حادثات نہیں واقع ہوں گے۔ کتاب اللہ کے دو معیار تو ضرور ہوں گے۔ ایک وہ معیار جو خدائے بزرگ وبرتر کا ہے جس کی فہم وفراست سے وہ کتاب مرتب ہوئی اور دوسرا وہ معیار جو اسے کتاب کے سمجھنے کے انسانی ماہرین کو عطا کیا۔

کسی انسان کا خدا کی عقل وفراست تک پہنچنا تو ناممکن ہے مگر اس کی بخشی ہوئی

نعمت عقل وفراست سے مطلوبہ اور لازم نتائج تک پہنچنے کے لیے بھی ایک معیار تو چاہیے ہوگا۔ آرٹس کے ایک پوسٹ گریجویٹ کو سائنس میں اس لیے داخلہ نہیں ملتا کہ وہ اس شاخ علم کی مبادیات سے بھی نا آشنا ہوتا ہے، حالانکہ درجہ علم برابر ہوتا ہے۔ کیا سائنس دان اور فلسفی جب چاہے کتاب اللہ پر رائے زنی کر سکتا ہے۔ جس شخص نے رہِ علم مذاہب میں کبھی ایک قدم نہ رکھا ہو، وہ ممکن ہے کتاب اللہ کا مفسر اور مبلغ ہو۔ کیا دورِ حاضر میں تنقیدِ مذہب کا یہ رجحان مضحکہ خیز نہیں۔

دور حاضر میں مذہب ایک پنچنگ بیگ (Punching Bag) بن کے رہ گیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی عمل کی کوتاہی مذہب کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ہر قسم کی زوال پذیری اور ذہنی افلاس تبدیلی مذہب کے نام ہے۔ جدت پسند اور رجعت پسند اپنی ذاتی اور مزاجی جنگ کے لیے جو اسباب منتخب کرتے ہیں، وہ مذہب اور ترقی ہے۔ ایسے لگتا ہے، دنیا نے اس صدی کے تجربات کا نچوڑ یہی لیا ہے کہ مذہب ترقی کے ہر راستہ کی رکاوٹ ہے۔ دوسری طرف مذاہب کے داعی یورپ میں تو شکست خوردہ ہو کر لادینیت کے رحم وکرم پر ہیں تا آنکہ ایک سخت ردِعمل انہیں دوبارہ لڑنے کی صلاحیت دے۔ اور مشرق میں مذہب اپنا مقام چھوڑنے پر راضی نہیں۔ مشرق میں مذہب سے آزادی ترقی کی ہم معنی نہیں ہو سکتی بلکہ غداری، بے ایمانی، مکر وفریب اور خودغرض اقتدار کے ہم معنی ٹھہری، جس کی وجہ سے مذہب نے اپنی بدترین شکل میں بھی لادینیت کو روکے رکھا۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) ، سوشلزم، کمیونزم پر فتح کے نشے میں

سرشار ہے۔ مذہب کے خلاف پوری قوت سے جنگ آزما ہوا، مگر اکیسویں صدی کے اواخر میں سرمایہ دارانہ نظام کو بھی اسلام سے نپٹنے کے لیے اپنے مذہبی تعصبات کا سہارا لینا پڑا۔

یہ جنگ جو مختلف فکری نظامات میں تھی، اب مذاہب اور تہذیبوں کے تصادم میں بدل گئی۔ یورپ کے ایوان اقتدار مشرق کے خودکش حملوں کی تندی سے لرز اٹھے ہیں اور باوجود بے پناہ ترقی اسباب کے یہ مضبوط معاشرتی اور معاشی ڈھانچے تنکوں کی طرح بکھرتا جارہا ہے۔ ابتدائے حال ہی میں یورپ اور امریکہ اپنے تمدن کی سب سے درخشاں روایت کو خیرباد کہہ گئے ہیں اور آزادی اور حریت کے قوانین نظر ثانی ہونے لگے ہیں۔ شخصی آزادی کے تصور محدود ہونے لگے اور ہر دھماکہ جو یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے، مذہب سے خوف اور اپنے حفاظتی حصار کی کمزوری کا ہے۔ مغربی تمدن اتنا بودا نکلا کہ اس کی کسی کو امید نہ تھی۔ شائستگی، رواداری اور فراخ دلی کی داستانیں سیاحوں کی زیبِ داستان خرافات لگتی ہیں۔ ان کے رویے تعلیم یافتہ لوگوں جیسے نہیں رہے۔ ان کے دانشور اپنے مصنوعی قد و قامت سے نکل کر بونے سے لگ رہے ہیں۔ جھوٹ پھر جھوٹ ہے اور شیطان کا مکر بہت بودا ہے۔ تارِ عنکبوت کو بکھیرنے کے لیے حق کا ایک پتھر کافی ہے اور خوفزدہ، ترساں و لرزاں تہذیب مغرب کو اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے شاید ایک دو اور حادثے فیصلہ کن نکلیں گے۔ سفاک اور خوفزدہ مغرب نے اس کا انتقام مشرق کی ان کمزور اور بے سروسامان قوموں سے لینا شروع کر دیا۔ قتل و غارت، ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کی جو آگ امریکہ نے روشن کر دی ہے، اس کا انجام مسلمانوں کو ان کے مخبر صادقؐ نے بتا بھی دیا مگر وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ یورپ اور امریکہ کو پتہ چل رہا ہے کہ وہ دوزخ کو اسی دنیا میں دیکھ لیں گے۔ عیسائیت کی طرح اسلام اپنے آپ کو کبھی مظلوم نہیں سمجھتا۔ قوم یہود آج تک ہر پیغمبر کے ارشاد کو غلط سمجھتی ہے اور مُصر ہے کہ خدا ان کا ہر کام بدست خود سر انجام دے۔ عیسائیت مظلومیتِ عیسیٰ کا بہانہ بنا کر گناہوں سے آزاد (Guilt Free) ہوگئی اس لیے اب مکر وفریب' دھونس دھاندلی، ظلم وستم، جبر وہلاکت کی باز پرس اُسے شرمندہ نہیں کرسکتی۔ گناہوں سے نجات یافتہ یہ قوم اب صرف گناہ کرتی ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر جناب عیسیٰ کو خاص مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مظلومیت کا مذہب نہیں۔ ہر دور میں اس کے اندر ایسے توانا اجزاء موجود رہے جو شکست وریخت کے ہر عمل سے گذرنے کے بعد بھی سلامت رہے۔ آج کے دور کا بحران بظاہر تو بڑا لگتا ہے مگر مسلمان اپنی داخلی مزاحمت کے جذبے سے محروم نہیں ہوئے۔ تشدد اور ردِعمل کی جو لہر ابھی افراد تک محدود ہے' اہل مغرب کی حماقتوں کی وجہ سے اہل اسلام کی اجتماعی جدوجہد میں ڈھل جانے کو ہے۔ قوموں کی زندگی میں صدیاں بھی سال ہوتے ہیں مگر اب شاید سال بھی باقی نہیں ہیں اور واقعات وحادثات قطرہ قطرہ کی بجائے مسلسل آبشار کی طرح گر رہے ہیں۔ زمانہ تطہیر کے مزاج میں ہے۔ انسانی ترقی اور عروج کی اس ناقص توجیہ پر افلاک کا استہزائی تبسم نظر آرہا ہے۔ اب شاید پیشین گوئیوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لیے بالکل تیار ہے۔

فلسفہ

فلسفہ اور مذہب میں بنیادی فرق اعتقادی نہیں ہے۔ فلسفہ جس اعتقاد کو Dogmatic کہہ کر رد کرتا ہے، وہ مذہب کے نزدیک Dogma نہیں ہوتا۔ مذہب جس حقیقت کے بارے میں قطعی وضاحت اور یقین رکھتا ہے، فلسفی اسے قابل بحث اور مشکوک قرار دیتا ہے۔ فلسفی مذہبی نہیں ہوتا مگر بنیادی طور پر کسی نہ کسی ذاتی مذہب کی تخلیق کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ فلسفی اپنی ذات کے اندر بھی ایک بحران کا شکار ہوتا ہے۔ اپنی فکری صلاحیتوں کو دوسروں سے کچھ بہتر پا کر وہ عمومی اعتقادات پر یقین کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ مذہب بنیادی تخلیقی اعتبارات پر گفتگو کرتا ہے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ مذہب کو کبھی بھی عمومی مذہبی اعتقادات سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ مذہب ان ذہین ترین لوگوں کی تحقیق اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ جنہوں نے مقصد حیات اور تخلیق کو اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے پوری زندگی علم کے اس اعلیٰ ترین استفسار میں بسر کی اور کوئی بھی پیغمبر یا ولی ایسا نہ تھا جو قریباً ایک ہی جیسی منازل سے گذرتے ہوئے ایک ہی جیسے تجربات کا سامنا کرتے ہوئے ایک ہی جواب پر نہ پہنچا ہو۔

اور شاید تمام انبیاء، اولیا اور محققینِ مذہب کا خلاصہ ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ ”خدا ہے“ ۔۔۔۔۔ فلسفی کو ہر اس اعتقاد سے ذہنی طور پر اختلاف واقع ہوتا ہے جس پر وہ اپنے غور و فکر سے سندِ اعتبار حاصل نہیں کرتا مگر زمانہ گذرا کہ تمام فلسفی ایک غلطی کا مسلسل شکار ہوتے رہے۔ اور یہ غلطی اتنے تسلسل سے دہرائی گئی کہ فلسفی کو دانشور اور عقلمند کہنا مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ گمان ہوتا ہے کہ اہلِ فلسفہ ایک ایسا گروہ ہے جنہوں نے ذہنی انانیت کی بناء پر عمومی اعتقاد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور علم کی ترجیحات کو مجروح کیا اور ایک حتمی حقیقت کو مشکوک اور مفروضہ قرار دینے کی کوشش کی۔ شاید کچھ لوگ فلسفہ کے دفاع میں چند ایک ایسے قول درج کرنے کے قابل ہو سکیں جن میں ان کم فہم عقلمندوں نے حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں فکرِ رسائی کی ہو مگر اس سے ان کی بنیادی حماقت کا ازالہ نہیں ہوتا۔ سائنس دان کو تو شاید اس لیے معاف کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تحقیق اور جستجو خالق کی نہیں بلکہ تخلیقات کے بارے میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ تحقیق کی کچھ ایسی حدود متعین کرتا ہے، جس سے باہر نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے سائنس کو کبھی مذہب کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا اور سائنس دانوں کی تمام مذہبی آراء صرف ذاتی موقف ٹھہرتی ہیں یا پھر جزوی وضاحتِ مذہب۔

مگر اہلِ فلسفہ کی یہ غلطی بخشی نہیں جا سکتی۔ ان کے فکری طرزِ عمل نے انسان کو منزل کے تعین سے بہت دور کر دیا۔ لفظ اور خیال کا طلسم کدہ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ عقلِ عیار کی مشعل لیے کوئی عمرو بھی اس میں نقب نہیں لگا سکتا۔ کیا عجب ہے کہ سقراط سے لے کر دورِ حاضر کے مفکرین تک اور ناقدانِ مذہب نے بنیادی سوال کی طرف توجہ نہیں کی۔ انہوں نے حقیقتِ مطلقہ کو ہمیشہ داخلی انسانی سوال سمجھا پھر اسے انسانی معاشرت اور تہذیب کا

دفاعی تصور خیال کیا۔ کسی بھی فلسفی کی کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس نے وجودِ مطلق کو ایک حقیقی آپشن تصور کرتے ہوئے اس پر برس ہا برس کی عرق ریزی کی ہو اور کبھی کسی حتمی رائے تک پہنچا ہو۔ فلسفہ نے شک و ریب کے امکانات تو بہت وسیع کر دیے مگر اس کا حل پیش کرنے میں ہمیشہ معذور رہا۔ نتیجتاً فلسفہ بھی رو بہ زوال ہوا۔ حتیٰ کہ آج کا فلسفی اپنی بقاء کے لیے اپنی ذیلی شاخوں یعنی نفسیات اور طبیعیات کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے ہی تخلیق کردہ سوال کی بے بسی کا شکار فلسفی قرآن کی اس آیت کا مصداق ہو گیا ہے کہ بے کراں سمندر میں پرانی کشتی پر ٹوٹی ہوئی پتوار کے ساتھ برق و باراں کی تاریکیوں کا یہ مسافر راستہ تو کبھی نہ پا سکا مگر بجلیوں کی چمک اسے کبھی کبھی تھوڑی دور تک سمندر دکھا دیتی ہے اور پھر وہ اور وہی عمقِ تیرہ و تار۔

مذہب نے کبھی بھی ترجیحِ اول سے دریغ نہیں کیا۔ بلکہ اگر آپ غور کریں تو اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی مذہب نے کوئی نہ کوئی الہیاتی منصب ضرور تخلیق کیا' بلکہ تمام تر مشرکانہ اور بت پرستانہ معاشرہ بھی ایک حتمی اور اعلیٰ ترین صاحبِ تخلیق قوت کا ادراک پیش کرتا رہا ہے۔ جیسے وہ اولمپیائی بت پرستانہ نظامِ دیوتائی ہو یا ہندومت کا خدائی کا تصورِ ثلاثہ۔

یہ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ مذہب محض ایک اعتقاد ہے اور اس میں کوئی ذہنی انکار کی صورت موجود نہیں اور یہ کہ مذہب محض ایک معاشرتی اور سماجی حل ہے۔ کسی معاشرے کے کم تر لوگوں کے صبر و استقامت کا باعث بنتا ہے یا یہ کہ مذہب ایک رہِ فرار ہے جو انسانی کم تری کے رجحانات کی پیداوار ہے یا مذہب ایک افیون ہے جو

زبردست زیردست کو مجبور و مقہور رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مذہب کے خلاف تمام تعصبات غیر اخلاقی رجحانات سے پیدا ہوئے ہوں گے یا ذاتی محرومیوں سے۔

اعلیٰ ترین ذہانت کے سب سے مشکل تجسس کے پیامبروں کو متعصب رویوں کا حامل قرار دینا۔ یہ انتہائی ناقص رائے تھی اور اس غلطی کا تدارک کرنے کی بجائے ان کم تر اذہان نے مذہب پر طنز و تشنیع اور دشنام کی زبانیں دراز کیں۔ اپنی لٹیا تو ڈبوئی تھی مگر جملہ انسانیت کے لیے بھی نجات کا واحد دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ کیا خدا نہیں تھا؟ نہیں ہے؟ کیا ان سب نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا؟ کیا انہوں نے اس انتہائی اہم حقیقت کو اپنی کم فہم عقل سے حل کر لیا تھا؟ کیا ان کو حتمی یقین حاصل تھا کہ اس موضوع کے ساتھ انہوں نے مکمل انصاف کیا؟ یقیناً نہیں۔ خدا فلسفی کا مدقوق تصور نہیں۔ خدا کوئی مفروضہ یا آپشن نہیں تھا۔ خدا ایک ایسی حقیقت تھا اور ہے کہ جس کی تحقیق پر زندگی کے انجام کا دار و مدار ہے۔ جس تحقیق کے نتیجہ میں آپ کو کائناتی اور آفاقی وسعت عطا کرتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ تمام تر انسانی استعماریت اور فکری جبریت کی تاریخ ہے‘ جس میں مذہبی جبر نمایاں نظر آتا ہے۔ عقلی اجتہاد اور فکری آزادی کی تحریکات کا مرکزی تصور مذہبی استعمار سے نجات حاصل کرنا ہے۔ یورپی مذہبی تحریکات نے مذہب سے آزادی کے لیے جس ذہنی ارتقاء کا آسرا لیا‘ وہ بھی تعصبات سے خالی نہیں تھا۔ ملائیت اور پاپائیت کی گرفت توڑنے کے لیے جرأت مندانہ فکری اظہار کا پیرایہ اختیار کیا گیا اور بعض مقامات پر تو جان و مال کی قربانیاں بھی دی گئیں۔ دونوں جانب سے ایسی انتہاپسندی کا ثبوت دیا جارہا تھا کہ کوئی بھی مفاہمت ممکن نہ تھی۔

اسلامی ممالک کشادہ روی اور مذہبی رواداری میں مغرب سے بہت آگے تھے‘ اور سوائے چند ایک استثنائی واقعات کے مذہبی تعصب کی فہرست میں شاید چند ایک واقعات بھی نظر نہیں آتے بلکہ یہی وہ رواداری تھی جس نے عیسائیت کو اپنے مذہبی افکار کی تجدید پر آمادہ کیا اور قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جو ترسیلِ علم بغداد اور قرطبہ سے ہوئی‘ اس نے تاریک دور کے یورپی ماحول کو منور کر دیا۔ مگر تحریکِ اصلاحِ مذہب اور تحریکِ اصلاحِ علوم

بھی اعتدال سے گذر گئیں۔ آزادی فکر کے طلوع شمس نے جہاں تعصباتِ مذہب کے اسرار منکشف کیے، وہاں ایک استہزا اور تحقیر کو بھی رواج دیا جو پاپائیت سے آگے بڑھ کر مذہب کے بنیادی عقائد پر وارد ہوگئی۔ ذمہ داری کے تعین میں اس وقت کے مفکرین نے افراد کے ساتھ عقائد کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرلیا۔ بریڈلو (Bradlow) جیسے سیکولر (Secular) علماء نے عیسائیت کی تعلیم میں بیشمار ایسے تضادات ڈھونڈھے جن سے مذہبی حقانیت متاثر ہونے لگی۔

مشرق میں معتزلہ اور دوسرے عقلیت پرست گروہوں نے یونانی مفکرین کی آراء کے زیر اثر اسلام سے انحراف کی گنجائش ڈھونڈی، مگر اسلام کبھی مکمل طور پر ملائیت کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس لیے چند ایک عصری توجیہات کے باوجود اسلام اپنے کائناتی اور آفاقی اصول قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔

مذہبی تعلیم چونکہ بذات خود عظیم اساتذہ کے ہاتھ سے نکل کر مقلدین کی فکری پسماندگی کی زد میں آچکی تھیں، اس لیے پندرہویں صدی عیسوی کے بعد ہم مذہب کو تمام تر دفاعی طرز عمل کا حامل دیکھتے ہیں۔ قوت و اختیار کے اس مجادلے میں عیسائیت شکست کھا گئی۔ اس کی بنیادی وجہ فکری پسماندگی، رسم و رواج کی تقلید، تعلیمی تغیرات سے ناآشنائی اور عصری فکری اجتہاد کو قبول نہ کرنا تھا۔ عوام کے اذہان پر جو اختیار انہیں صدیوں سے حاصل تھا، وہ کسی قیمت پر اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے اور نہ اس میں کسی شراکت ہی کے قائل تھے۔ انقلاب علم و فکر کے اس دور میں چند ایک رکاوٹوں کے باوجود لادینی تحریک نے

مذہب کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔

مشرق میں یہ صورت حال نہ تھی۔ مذہب کبھی بھی مکمل طور پر ملائیت کے قبضہ میں نہیں گیا اور کسی بھی دور میں ملحدانہ کش مکش نے مذہب کو متاثر نہیں کیا۔ اس کی وجہ اسلام کا سادہ اور موثر فلسفہ، ابہام اور تضاد سے آزاد پیغام' اس کے فلاح و بہبودِ انسان کے بنیادی نظام، رواداری اور عصری تقاضوں کے مقابل مستحکم تہذیب و تمدن اور فتوحات کا تسلسل تھا۔ معاشی اور معاشرتی نظام، عدل و انصاف اور اہلِ ذمہ کے حقوق کا تحفظ تو بدترین دور اسلام میں بھی متاثر نہیں ہوا۔

اسلام میں کبھی بھی عوامی انقلاب نہیں آیا۔ یورپ کی طرح اسلامی معاشرہ کبھی بقاء کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ مگر اسلام کے علاوہ جو سب سے بڑی وجہ تھی' وہ قرآن تھا۔ وہ پیغام جو ہر شک و شبہ سے بالا، لفظ اور حرف کے تغیرات سے بالا اپنی ذاتی علمی حیثیت میں کبھی مشکوک نہیں رہا۔ پندرہ سو برس سے اس کے کسی نقطہ اور حرف میں کوئی تغیر وارد نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسی حیران کن اور معجزاتی تفریق تھی جس کا کوئی تدارک عقل جدید کے علمبرداروں کے پاس نہیں تھا۔ باقی الہامی کتابوں کے برعکس اس کا الہامی رتبہ واضح اور اس کا علمی معیار ہر تنقید سے بالا تھا۔ قرآن کے مقابل تمام مذہبی کتب شخصی اور ذاتی تاثرات لگتی ہیں۔ اگرچہ کہیں نہ کہیں ان میں خدائے بزرگ و برتر کے احکام اور افکار کی جھلک نظر آتی ہے' مگر انسانی تاثرات کی آمیزش اور آیات کی تحریف نمایاں طور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان جملہ الہامی کتابوں میں خدا کے احکام سے شناسائی کی جھلک تو نظر آتی ہے مگر زبان و بیان کا

الہامی رتبہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی پیغمبر عالی مقام نے اس کی حفاظت اور تقدس کا کوئی طریقہ ہی وضع کیا۔ توریت اور انجیل کو پیغامِ خدا کا رتبہ تو ملا مگر حرفِ خدا کا درجہ نہ مل سکا۔ اس وجہ سے بعد میں آنے والے علماء کو حرص انانیت اور جاہ پرستی کے حصول کے لیے ان کتابوں میں تحریفِ لفظی کا موقع مل گیا۔ یہی بڑی وجہ تھی' اللہ نے انہیں اپنا پیغام کہا مگر اپنا کلام نہیں فرمایا اور وضاحت سے قرآن میں ارشاد فرمایا کہ میں اب ان تحریف شدہ کتابوں کو سندِ اعتبار نہیں دیتا اور اگر تمہیں میرے احکام کے بارے میں بلاشک وشبہ کوئی سند چاہیے تو وہ صرف قرآن ہے۔ قرآن اور دوسری الہامی کتب کا یہ فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان کا کوئی بھی موازنہ غیر عقلی لگتا ہے۔ عصر حاضر میں جن لوگوں نے الہامی کتب کے موازنہ اور تقابل کا طرز اختیار کیا' وہ غیر معقول اور احمقانہ تھا۔ اہل علم وعقل کے نزدیک اس قسم کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ قرآنی ٹیکسٹ اور باقی الہامی ٹیکسٹ کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا جائے۔ قرآن کے مقابل نہ صرف الہامی بلکہ دنیا کی کوئی بھی دوسری تحریر معتبر نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے اسلام کا عقل پرست طبقہ جدید ترین خیالات کے آلات کے استعمال کے باوجود تحریف کا تو نہیں' مگر تاویل کا قائل نظر آتا ہے۔ جہاں قرآن اپنے مرتبہ صحت کے کلام میں غیر متبدل رہا' تحریف کے تصرف سے آزاد رہا' وہاں شاید ہر زمانہ میں ایک خطرہ سے بھی دوچار رہا۔

زمانوں کے تغیر وتبدل میں، ترقی اور تنزل کے ادوار میں، انسانی خیالات کی ترویج، فکری جد وجہد، تجسس، شکوک وشبہات کے لیے یہ کتاب ایک کھلے درجہ کا چیلنج رکھتی تھی۔ آگہی اور ترقی فکر کے ہر دور میں قرآن تازہ ترین ذہنی انقلابوں کے متقابل رہا اور پھر بھی ہر شکست وریخت سے محفوظ رہا۔ کوئی بھی عصر قرآنی معلومات کو ناقص قرار نہ

دے سکا‘ مگر یہ کہ بعض ادوار میں انسانی علم ناقص رہا ہو اور قرآنی علوم کے درجہ فراست تک نہ پہنچا ہو۔

ازمنۂ وسطیٰ کی علمی تحقیقات اور علمی انکشافات بذاتہ صحت اور یقین سے دور تھے اور آج کے دن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام علوم جو اس عرصہ میں آگے بڑھے اور ترویج پائے‘ اب قصہ پارینہ لگتے ہیں اور جن حقائق کے بارے میں جو رائے اس وقت دی گئی‘ وہ معصوم اور جاہلانہ لگتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کی تحقیق کو ہم دادِ جستجو دے سکیں۔ ان کے نتائج سے متفق ہونا کسی طور بھی ممکن نہیں رہا۔ قرآن تو نا قابلِ تغیر تھا اور ہے‘ اس لیے ہر دور کے علماء کو قرآنی تفسیر کے لیے اجتہادی تاویلات سے کام لیا پڑا‘ مگر علماء کے تعلیمی نقائص کی وجہ سے بعض ادوار میں کتاب حکیم کی کچھ حتمی اور یقینی آیات میں سائنسی اور تحقیقی اعتراض کی گنجائش نکل آئی جس کی وجہ صرف علم و معرفت کی کمی اور تحقیق و جستجو کا تجرباتی دور تھا۔ مگر سائنس اور علمی تحقیق کا جو بھی حتمی فیصلہ انسان نے دیا‘ وہ تائید قرآن اور اعتراف پروردگار میں تھا۔ اس کے برعکس باقی مذاہب میں اور انکشافِ حقائق میں واضح تضادات محسوس ہونے لگے جس کی وجہ سے باقی مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مذہب کی اندھا دھند تقلید کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

دانشور اور عقلا کی اجلتوں نے مذاہب میں کوئی تخصیص نہ کی۔ یورپی مفکرین اور ان کی تقلید میں بعض مشرقی دانشوروں نے بھی مذہب کو رجعت پسندانہ نظریہ قرار دے کر اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی فکری اجتہاد کو مذہب سے متصادم نظریہ قرار دیا۔

جو ان علماء کا اپنا حجابِ علم تھا اور اس میں کوئی سچائی موجود نہ تھی۔ قرآنی دستاویز پر سرسری نظر ڈالنے اور اس کے مطالعہ میں غور و فکر نہ کرنے کی بدولت ایک نیا جاہلانہ تقلیدی رجحان پیدا ہوا، جس میں مذہب کو ناقابلِ عمل درجہ قرار دے کر عصرِ جدید کے جبلی رویوں کی تائید کی گئی اور کسی بھی عالم نے قرآن پڑھنا اور سمجھنا تضیع اوقات سمجھا۔ قرآن پڑھنے والے بھی غور و فکر کی بجائے تلاوت اور قرأت کے حسن تک محدود رہ گئے۔ کچھ نے حصولِ رزق کے لیے کتابِ حکیم کو ذریعہ منتخب کیا اور کچھ نے اپنی ناقص تاویلات کے ذریعہ علم و حکمت کے اس عظیم الہامی ماخذ کو اپنے مدارس کے در و دیوار میں چن دیا۔ محدود فکری صلاحیتوں کے حامل ان مدارس کے اساتذہ نے اپنے علمی استحقاق کو بلند و بالا القابات سے نمایاں کیا۔ اپنی جاہلانہ تاویلات کو تنقید و تنقیص سے بالا قرار دیا اور قرآن کو اپنی خود نوشت تحریرات کے مناصب پر رکھ کر تعصباتِ فکر کی ایسی دیواریں کھڑی کیں کہ امت مسلمہ عرفانِ حقائق کی بجائے وضاحتِ مسائل تک محدود ہو گئی۔

معترضین جو یقیناً ان اساتذہ مکاتب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین تر تھے، مکتب کے ان اساتذہ کی محدود علمی تاویلات قرآن کا معیار سمجھے اور اسلام کو تعصب اور تشدد کا مذہب قرار دیا۔ عیسائیت اور باقی مذاہب کو تو وہ پہلے ہی رسم و رواج تک محدود کر بیٹھے تھے۔ اب اسلام کی باری آئی۔ کمیونزم، سوشلزم جو پہلے ہی زمانہ وسطیٰ کے جبری اعتقاد کی طرح لوگوں پر وارد ہوا تھا اور جس کی اپروچ صرف مسائل دنیا تک تھی، انہوں نے اسلام کے تمام مابعد الطبیعیاتی اور کائناتی حقائق کو عہد قدیم کی اساطیر قرار دیا۔ اپنے مادیت کے فلسفہ ہی کو حرفِ آخر سمجھا۔ مسلمانوں کی حالت زار اور ان کے عملی مظاہرات کو اپنی کامیابی کی دلیل

بنانا چاہا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ چونکہ اس کا مقابلہ لادینی یورپی معاشرتی آزادی فکر اور آزادانہ تجارتی ممالک کے ساتھ ہوا، وہ اپنی کوتاہ بینی اور محدود دنیاوی اپروچ کی وجہ سے یہ جنگ ہار گیا۔

اب اسلام اور لادینی معاشرے آمنے سامنے ہیں۔ اسلام کے پاس آلات جنگ بھی کم اور آلات ذہن بھی کم تر ہیں۔ وسیع تر لادینی معاشرے کی آسانیوں نے انسانوں کو سرعت سے اپنی طرف راغب کر لیا۔ مذہبی اقدار کو حریت فکر اور شخصی آزادی کا حریف قرار دیا۔ عیسائیت کے پاس مصالحت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اسے لادینی آزاد معاشرے کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ اس نے جلد ہی مغلوبیت قبول کر لی اور آزاد لادینی معاشروں میں مذہب اب ایک ذاتی رجحان کی طرح زندہ ہے جسے اس حد تک اخلاقیات سے گرنا پڑا کہ ہم جنسی جیسے مکروہ ترین افعال کو بھی سند قبول دینی پڑی۔ اسلام بدستور سربکف ہے۔ اللہ کا دین غیر سے اتنا شاکی نہیں مگر اپنے ماننے والوں کے ریا و کبر کا شکار ہے۔ اعلیٰ مقاصد کے نظر انداز کر دینے کے نتیجے میں امت مسلمہ گروہی آزار میں مبتلا ہے۔ ملائیت کے جبر نے اس میں اخلاص و فکر کی صلاحیتوں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مسلمان مذہب کے بنیادی مقصد سے روگرداں ہو کر ہر روز تاویل کے نئے مدرسے تعمیر کر رہے ہیں۔ معمولی اذہان کے لوگ مذہب کو ذاتی وجاہت اور اقتدار کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اعلیٰ ترین مذہبی درسگاہیں بھی متعصبانہ رویوں کو فروغ دے رہی ہیں۔ دین کو اللہ سے جدا کرنے کا یہ عمل پچھلی ڈیڑھ صدی سے جاری تمام تحریکات، فری میسنری (Freemasonry) شائل پر اخفا، ممبر سازی اور شخصی تعلیمی رجحانات کی حوصلہ

افزائی کر رہی ہیں۔ امت مسلمہ لامذہب تو نہیں ہوئی مگر عمومی طور پر مذہبی بے حسی کا شکار ہے۔ وہ اپنے اندر بین الاقوامی رجحانات کی عکاس ہے۔ مذہب کی نسبت دوسرے اقتصادی اور سائنسی اعتقادات کی زیادہ قائل ہے اور واضح طور پر اس خواہش کی مظہر ہے کہ مذہب کی بجائے مروجہ طرزِ فکر کی پیروی کی جائے۔ کم تعلیم یافتہ اور کم ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومتیں مذہب کی بجائے قومیت اور اقتدار کے حصول کی زیادہ خواہاں ہیں۔ چند اشخاص یا گروہ امتِ مسلمہ کے ذہنی رویوں کی قیادت کر رہے ہیں اور یہ زیادہ تر مغربی تصورات کے خوشہ چیں ہیں۔ ان کی اپنی کوئی شخصیت' کوئی نظریاتی ترجیح نہیں۔ یہ کم فہم امراء اور علماء یورپ کی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ اور مغربی کلچر کی آزادیوں کے پروہت لادینی معاشرے کی تخلیق کے لیے سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور اسلام کے کوتاہ بیں اور کم تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابل نیا چرچ تخلیق کر رہے ہیں۔ شخصی آزادیوں کے نام پر جدید ابلاغ کے ذرائع شب و روز مادر پدر آزاد معاشرے کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان کی راہ کا کانٹا بھی مذہب ہی ہے۔

یہ تصادمِ مشرق و مغرب میں نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ہر سطح پر نمایاں ہے۔ اسلام سر بلند ہے اور شاید منتظر بھی کہ قرون اُولیٰ کے اخلاص اور صاف و شفاف ذہانتوں کے لوگ کب خدائے بزرگ و برتر کی محبتوں کے علم بلند کر کے اس فطری اسلامی معاشرہ کی تخلیق کریں۔ جیسا پہلے زمین و آسمان میں نہ گذرا ہو۔ جہاں خدائے واحد کی محبت اور شناخت ہی احساسِ مذہب، جہاں جبر و استبداد کی بجائے علم و معرفت کو اقتدار حاصل ہوتا ہے' جہاں چند روزہ دنیاوی زندگی کی اصلاح کے ساتھ لاانتہا بے کراں ماورائی زندگی کی

بھی تیاری کی جاتی ہے، جہاں انسان پر موت وحیات کے توارد کے سوا کوئی بے چینی اور اضطراب اثر انداز نہیں ہوتا، جہاں پر برکت ورحمت کے الفاظ اپنا مفہوم پا جاتے ہیں اور یہ کوئی مفروضہ جنت بھی نہیں۔ عہد رسولؐ وخلفاء کے معاشرے کی تخلیق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مگر افسوس کہ یہ واحد تاریخی حقیقت ہے جس نے بعد کے ادوار میں کبھی اپنے آپ کو دہرایا نہیں۔

تعلیم و تربیت کے معیار دو ہی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگوں کو رہِ مستقیم کی ہدایت کرتے اور ان کی یقینی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں یا پھر ان کو اتنے ذہنی آلات اور صلاحیتیں مہیا کر دیتے ہیں کہ وہ از خود مناسب ترین نتائج پر پہنچ سکے۔ استادِ اول تو اللہ ہی تھا کہ اس نے بے سر و سامان اور مجبورِ محض انسان کو زمین پر امانت عقل سے نوازا، استعمال عقل کا شعور بخشا، تجربات اور مشاہدات کی نگرانی بخشی، ماضی حال اور مستقبل کے تجربات اخذ کرنے کی صلاحیت بخشی اور کاروانِ حیات کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ ایسی تو کوئی بھی قوت نظر نہیں آتی جو واضح طور پر ابتدائی انسان کے احساس علم کو فروغ دیتی نظر آئے۔ تجربات تو جانور کو بھی نصیب ہوئے ہیں۔ مگر کیا وہ پھر اسے جبلی ذہانت کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے کہ کوئی جانور قرن ہا قرن کے انسانی استحصال کا توڑ دریافت کرنے کے قابل ہو سکا۔ کیا کوئی جانور اس قابل ہوا کہ انسان کا بوجھ اپنے سروں سے اتار کر ایک محفوظ تر دنیا تخلیق کر سکے۔ قطعاً نہیں۔ مگر انسان اس کے برعکس ایک غیر معمولی صفتِ برتری کی وجہ سے واضح سیادت حاصل کر گیا اور اس کے اس اقتدار کو دنیا کی کسی اور مخلوق نے چیلنج نہیں کیا۔

عجب بات ہے کہ خدائے بزرگ و برتر عقل کی اس نعمت کو قرآن میں امانت کہتا ہے۔ وہ اسے صلاحیت نہیں کہتا۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ ہمیشہ سے انسانی ملکیت رہی ہو اور موت کے بعد بھی انسانی حکومت کا باعث بنی ہو۔ امانت کی کچھ ذمہ داری ہے۔ ایک ایسی نعمت جو دی گئی اور جو واپس لے لی جائے گی۔ اس کا دنیا پر کوئی مصرف تو ہوگا۔ امانت عقل کا ذاتی انسانی ملکیت نہ ہونا واضح ہے۔ علوم عمرانیات کی روشنی میں ابتداء کے انسان اور پرائی میٹ (Primates) سے پہلے کی انسانی جبلی تاریخ جانور اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ دہر میں بہت طویل عرصہ حضرت انسان ایسے رہے کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھے۔ باقی مخلوقات کے ساتھ یہ بھی ایسی واحد خلیاتی مخلوق تھے۔ پھر بقول قرآن اللہ نے اسے دہرا خلیاتی وجود بخشا۔ منفی اور مثبت، داخلی اور خارجی، مرد اور عورت اور یہ ثنویت باقی مخلوقات کو بھی بخشی۔ جیسے پودوں کو پسٹل اور سٹیمن۔ تخلیق زندگی کا یہ طریقہ آگے بڑھتا ہوا جامد اور متحرک حیات کے تصور سے بدل گیا۔ واحدیت سے ثنویت پھر جمود و تحرک کی ثنویت۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے تخلیق میں ہمیں سکوت اور سماعت کی ثنویت نظر آتی ہے۔ کچھ مخلوقات کو بصارت اور سماعت عطا ہوئی۔ اس میں بھی انسان شامل ہے۔ مگر ابھی اسے کوئی تخصیص حاصل نہ تھی کہ اس سے جواب طلبی ہو یا کسی امانت کا شعور ہو۔ مدتوں زمانوں کے تسلسل میں جامدارانہ ہم آہنگی نظر آتی ہے اور انسان باقی تخلیقات سے مختلف نظر نہیں آتا۔

تجرباتِ پروردگار آگے بڑھے اور ہمیں اچانک تاریخِ حیات کے افسانے میں نیا

رنگ ابھرتا نظر آتا ہے۔ کسی غیر معمولی انوکھے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اچانک انسان سوچنے لگتا ہے۔ یہ اچانک پن انسان کے کسی علمی ادراک میں بھی نہیں۔ یہ دلچسپ حادثہ کب اور کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب ابھی حضرتِ انسان کے پاس نہیں۔ وہ اپنی تمام تر آگہی کے باوجود یہ سراغ نہ پا سکا کہ اس نے کب سوچنا شروع کیا۔ سوائے مذہب کے اس کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ شاید انسانوں کی طویل تاریخ میں کسی بھی شئے کی ابتداء کا جواب اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں دیتا۔ اخروٹ اخروٹ کیوں ہوا اور بادام بادام کیوں بنا۔ تبدیلی تو شاید باپ بیٹے کے نقوش و عادات میں بھی آجاتی ہے مگر اتنا عظیم اور وسیع تنوع جو مخلوقات زمین میں بکھرا ہوا ہے’ ایک ارب کے قریب مخلوقات زمین کی اقسام اور ہر مخلوق کسی نہ کسی مقصدِ حیات کی نشاندہی کرتی ہوتی’ اتنا آسان نہیں’ اس کی وضاحت پیش کرنا۔ اور حیاتِ انسانی کے تمام متعلقہ علوم تھوڑی سی روشنی میں ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں اور پھر ظن و تخمین کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

پھر یہی انسان باشعور ہوا، بستیاں بسائیں، ذخائر تعمیر کئے’ معاشرت کے انداز اختیار کیے۔ خیر و شر کے تصادم کا شکار ہوا۔ مکمل بربریت کا مظہر ہونے کے باوجود آدمیت کا پہلو بھی اس میں نمایاں ہونے لگا۔ اس خصوصی صفت سے جس نے انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کیا۔ خلافتِ ارضی کا منصب تو طے ہو گیا مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی قیمت کیا ادا کرنی ہے۔ نصف تاریخ حیات میں جو صفت ہماری نہ تھی’ جس کی وجہ سے ہم نے زمین کی سیادت اور قیادت کا شرف حاصل کیا۔ کیا وہ صرف ہمارے انسانی تکبرات کو ہوا دینے کے لیے تھی۔ کیا وہ ایک ذاتی استحقاق تھا’ جس کی ترقی و تربیت کے بعد ہم نے شجر و حجر، درند و

چہ ند کا استحصال کرتا تھا اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے اختیار و اقتدار کے لیے ، مال و اسباب کے لیے باہمی قتل و غارت کا بندوبست کرتا تھا یا اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔ وہ مقصد تاریخ انسان میں بار بار دہرایا گیا' بار بار بھلایا گیا۔ وہ مقصد جو ہمارے غور و فکر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ خارجی اور غیر انسانی القا اور الہام تھا' جس کے لیے ایک طویل فہرست ان پیغمبروں ، صلحا اور اولیاء کی نظر آتی ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگیوں کو تعلیم و تربیت انسان کے لیے وقف کیا۔ بار بار کسی بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی کرائی اور جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ عقل و معرفت جو تمہیں عطا ہوئی ہے' تمہاری ذاتی ملکیت نہیں بلکہ امانت ہے۔ اس امانت کا استعمال تم پر مباح و حلال ہے' مگر اس کے غلط استعمال کے نتیجے میں ایک طویل عرصہ ابتلا ہے اور اس کے صحیح استعمال میں لا انتہا زندگی کا اقتدار ہے۔

یہ امانت کوئی ٹیکس جمع کرنے کے لیے نہ تھی۔ اس کا معاوضہ زر و مال اور اسباب کی صورت میں نہ تھا۔ امانت کی قیمت انسان کے مال و اسباب کی محرومی نہ تھی اور نہ زمین بدری ہی کی شکل میں تھی۔ امانت کے استعمال کا نتیجہ واضح تھا۔ سوال نامہ مختصر اور جواب واضح تھا۔ پہلے سے متعین اور مقرر تھا۔ صرف اپنے اعتبارات اور شواہد سے اسے کنفرم (Conform) کرنا تھا۔ " ان ھدینہ السبیل اما شاکرا و اما کفوراہ " (بے شک ہم نے اس کو راہ دکھائی (ہدایت دی) چاہے وہ شکر کرے یا کفر کرے)۔ کمرہ امتحان کا ماحول قابل رشک بنایا۔ نہ کوئی ممتحن نہ نگران' ہر عہد اور مقام اشارات اور منازل کی نشاندہی' مسلسل کتابوں کا ورود نسیان و کم فہمی دور کرنے کے لیے ہر قسم کی علمی اور عقلی مدد فراہم کی گئی۔ کوشش کی گئی اور کوئی کسر نہ چھوڑی گئی اور کوئی عذر باقی نہ رکھا گیا۔ شناخت پروردگار کو انتہائی قابل فہم ، آسان اور قابل قبول بنایا گیا۔ پھر یہ کیا حادثہ ہے۔ کیا المیہ ہے۔ عقل ہونے کے

باوجود، علم ہونے کے باوجود، استاد ہونے کے باوجود، جملہ اشارات کے باوجود انسان ظالم اور جاہل ٹھہرا۔

جبلت اور عقلیت کی ثنویت میں بار بار جہالت کیوں جیتی۔ انسان کیوں ہارا۔ یہ جنگ بالآخر خسارے پر منتج ہوئی۔ معدودے چند اشرافیہ کے سوا صاحب عقل و فہم لوگوں نے ترقی کے مفہوم کیوں بدل دیے۔ عقل فتنہ ساماں کیوں ٹھہری، مکر و فریب، ظلم و نا انصافی، جبر و استبداد کیوں طریقِ بشریت ٹھہرا۔ انسان نے امانت میں خیانت کی، حقِ عبادت ادا نہ کیا۔ کیا انسان اس شیطان سے بہتر ہے جس نے روزِ ازل نسلی اور جسمانی تفاخر کی بنا پر انسان کو حقیر جانا۔ کیا نفس انسان کے فریب نے تکبرات اور تمرّد کا وہی منظر تخلیق نہیں کیا۔ بلکہ اس سے بدتر شیطان نے کبھی اللہ کی کبریائی اور بندگی سے انکار نہ کیا اور انسان معبدِ نفس کا پجاری، زمانوں کے تواتر میں مسلسل اور متواتر نہ صرف انکارِ خدا پر قائم رہا بلکہ اپنی خدائی کے اقرار پر مُصر رہا۔ اس احساس ناشناس پر رحم کیا جانا چاہیے۔ کیا اس خودغرض حریصِ ذات پر بھی کوئی کرم ہونا چاہیے۔ مگر یہ کہ "اللہ جہانوں کا پالنے والا، رحمٰن اور رحیم ہے"۔

صدیوں سے نفسِ انسان پر غور و فکر جاری ہے اور جب سے نفس کی آگہی، اللہ کی پہچان ٹھہری۔ قافلۂ عشق کے مسافروں کو اس طلسم ہوش ربا کی کشاد میں نجات کی تلاش رہی۔ خود شناسی، خوش فہمی، شناختِ ذات، مختلف ناموں سے اس چیستان کی ادھیڑ بُن جاری رہی۔ بہت ہی کم لوگ اس کے معانی تک رسائی پا سکے۔ اور وہ جو اس سے خوفزدہ تھے، آگہی پا کر اور خوفزدہ ہوئے۔ جاننے والوں نے اس کو ذاتِ انسان کے ایسے سفاک دشمن کی طرح شناخت کیا جسے حلال و حرام، خیر و شر، فتنہ و امن، غربت و امارت، جنگ و امن، مثبت و منفی ہر صورت میں انسان پر حاوی پایا۔ فاتحین کے جاہ و جلال میں اور مفتوحین کی حالتِ زار میں، علم و دانش کی سرفرازیوں اور جہلاء کے تعصبات میں، امراء کی طلب و جاہت اور غرباء کی عذر داریوں میں، ادیبوں کی لذتِ تحریر اور بے ادبوں کی گستاخ زبانوں میں، حسن و عشق کی داستانوں اور جنسی ضروریات کے پس منظر میں، کہاں کہاں پہ یہ نفسِ خراب کار نہیں۔ مگر یہ تھا کیا! اور یہ ہے کیا! معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں تھا۔ برس ہا برس کے جانورانہ خصائل نے دورانِ زمانہ میں انسان کے باطن میں مستقل جگہ بنائی تھی۔ بقا اور دفاعِ ذات سے جو زندگی شروع ہوئی' وہ پیچیدہ تر نظامِ معاشرت اور معیشت میں بھی اپنے خصائل کو ترک نہ کر سکی۔ تمام

انسانی نظام چاہے کتنے ہی ہمدردانہ نظر آتے ہوں، بنیادی طور پر کسی نہ کسی حسِ تسکین کے معاون رہے۔ اگرچہ میدانِ جنگ و مسابقت بدل گئے اور وہ جنگ جو انسان اور جانور کے درمیان تھی ختم ہوگئی مگر ہوموسیپین (Homosapian) کی باہمی مسابقت کی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ انسان مجموعی طور پر زمین پر فرد تھا اور دوسری اقسامِ حیات کے مقابل میں اپنی انفرادیت کا قائل اور حامل تھا۔ رحم و کرم کے ساتھ تمرد و تفاخر کے جذبات محکم ہوتے گئے۔ بقا جُلِ حیات ہے۔ کاروانِ نمل میں سلیمانؑ نے جو حسِ بقا پائی، وہ فیلانِ مست کے گروہ بھی اس طرح موجزن اور اپنی متنوع اور متلون اقسام کے ساتھ اوصافِ انسان میں بھی شامل تھی۔ بقائے حیات سے نفسِ انسان نے ابتداء کی۔ علم و فکر نے صرف اس میں طریقہ کار کا اختلاف پیدا کیا۔ اس سے نجات حاصل نہ کی۔ وہ تمام علوم و فنون جو انسان نے کسبِ حقیقت میں پروان چڑھائے اور وہ طریقے جو تہذیب انسان کی ترقی کے لیے اختیار کیے۔ ان کا مرکز و محور بھی آسانی، کشادگی اور تعمیر نفس ہی تھا۔ نفس نے انسان کے لیے اپنے لیے ہمدردی اور انس کے ذرائع تخلیق کیے کہ یہ انسانیت ہی سمجھا جانے لگا۔ جو چیز شعور، ذہن اور جزوِ زندگی بن کر رگ و پے میں متحرک ہوئے انسان اپنا دشمن کیسے سمجھ سکتا تھا۔ باوجود تلقین اور رشد و ہدایت کے یہ کام بہت ہی مشکل تھا کہ انسان اپنا دشمن آپ بن جاتا۔ یہ جنگ کس کے لیے لڑی جاتی اور اس کا انعام کیا ہوسکتا تھا۔ خدا کی دوستی اور نظر سے اوجھل ایک جنت!

نفس کی بنیاد اسبابِ ظاہری پر ہے۔ یہ انسان کو حواسِ خمسہ کے ذریعے قائل کرتا ہے۔ خدا اور عقل تو بہر حال حواسِ خمسہ سے دور، قلب و نظر کی حدود سے ورا ایک ایسا سراب اور وعدہ تھا جو موت سے پہلے کبھی آزمایا نہیں جا سکتا تھا۔ نفس انسان کا اعصابی نظام ہے،

اس کا لڑکپن ہے، اس کی جوانی اور بڑھاپا ہے، نفسِ انسانی ضروریات کا پیکٹ ہے۔ بنیادی جبلتوں کا ایک دفاعی نظام جو عہدِ قدیم سے اتنا طاقتور رہو چکا ہے کہ تمام علم و معرفت بھی اس کے مدافعاتی حربوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ بقائے حیات کی خندق میں گھسا ہوا یہ جنگجو علم و عقل کے تمام حملوں سے بچاؤ کی تدابیر جانتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اپنے محکوم کی ہمدردی اور انس ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو انسان جیتنا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے مقتول کا کوئی قصاص نہیں، کوئی دیت نہیں۔ بقول ربِّ کریم نفسِ انسان کی صورت میں اللہ نے اپنا سب سے بڑا دشمن تخلیق کیا۔ انسان کے باطن میں اسی دجال کی حکمرانی ہے۔ اس کی تخلیق کاری بھی تباہ کاری ہے۔ یہ تم میں تو ہے اور مجھ میں، میں ہوں۔ یہ انفرادیت ہے، تقسیم کار ہے اور ہر شخص میں شخصیت ہے، عالموں میں ان کے علم کا مظاہرہ ہے، جاہلوں کا خناس ہے، زاہدوں میں تقدس اور زہد ہے، ادیبوں میں شہرت اور حکمرانوں میں طلبِ جاہ ہے۔

نفسیات دانوں نے اس جبلی پیکٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی رویوں کے اصول ڈھونڈے، ان کے احساس کو کمتری اور برتری میں پرکھا۔ کمپلیکس (Complex)، فوبیاز (Phobias)، نیوراسس (Neurosis)، سائیکوس (Psychosis)، اوہام اور وساوس، جنون و مراق، کیا کچھ نہ ذہنِ انسان سے نکالا۔ خوف اور حزن کے بنیادی اسباب تلاش کیے، مگر کیوں؟

ان کا مقصد نہ خدا کو جاننا تھا، نہ خدا کے لیے نفس ہی کو جاننا۔ وہ تو بس ایک منفعل اور بے کار، حرماں نصیب، شکست خوردہ، نفس کو دوبارہ فعال، منضبط اور طاقتور کرنا چاہتے

ہیں، تا کہ بقا کی جنگ میں دوبارہ شریک ہو سکے۔ نفسیات دانوں اور صوفیاء میں بس ایک ہی فرق ہوتا ہے۔ وہ نفس کو نفس کے لیے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور صوفیاء نفس خدا کی خدمت میں ایستادہ کرنا چاہتے ہیں۔ نفس اور ہوا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خواہش اور ہوا نفس کی ترجیحات مرتب کرتے ہیں۔ شیطان کی ہم رکاب اور ہم جلیس خواہشات نفس کے موسم میں تغیر پیدا کرتی ہیں۔ نفس قبضۂ غاصبانہ کا حریص اپنی ملکیتوں کا بخیل اور دوسروں کی املاک کا غاصب ہے۔ عفو و درگذر تو درکنار اس کے تمام مہذبانہ رویے، کیموفلاج (Camouflage) اور دفاعی حربے ہیں۔ یہ ناپُرس شہرِ ناپُرساں کا حکمران ہے۔ اس سے رحم کی اپیل اس کے تمرّد کو ہوا دینا ہے۔ شکست خوردگی میں یہ خطرناک اور اذیت پسند ہے۔ اس کی تمام تر مخالفت اس اجنبی روح سے ہے جو دیارِ غیر سے آ کے اس کے ہاں مہمان ہوتی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ وہ کبھی واپس نہ پلٹے۔ روح کی ترجیح واضح اور افضل ہے۔ وہ خدائے واحد کا شعور رکھتی ہے اور باوجود ناسوت کا قیدی ہونے کے اس کی آرزوئے بقائے ربانی نہیں جاتی۔ نفس اس کی یاد اور آرزو کا دشمن چاہِ بابل میں گرفتار فرشتوں کی طرح روح کو پابندِ جسم و ذہن کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے۔ آدمیت اور انسانیت کی اس جنگ میں یہ شیطان سے معاونت طلب کرتا ہے اور ملائے اعلیٰ کی طرف جانے والے راستے مسدود کرتا ہے۔ صدیوں کے تجربات کا حامل ہونے کی وجہ سے ایک ہولناک مجموعی طاقت ہے جس پر کوئی فرد بھی بغیر خدا غالب نہیں آ سکتا۔ جیسے یوسفؑ نے کہا، نفس سے کون آزاد ہے۔ نفس تو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے۔ ہاں اگر اللہ رحم فرمائے تو روح اس بے رحم تاوان گیر کے تسلط سے بچ نکلے۔ اللہ نے اس دشمن سے اعلانِ جنگ فرمایا ہے۔ کہا جو مجھ سے محبت اور انس رکھے گا، نفس کے ہر اشکال اور ہوا کی ہر لہر کی مخالفت کرے گا۔ نفس اپنے مردوں کو ہر عصر میں نئے

کفن دیتا ہے۔ اولمپس کے دیوتا نہ سہی، برہما شیوا وشنو نہ سہی۔ عشتار اور آئی سس نہ سہی' تجرید کے نمونے سہی۔ اجسام کی عبادت نہ سہی، عادات ومشاغل کی تقریبات، شراب وسُکر کی مفاہمت سہی، الحاد اور ادبیت کی آمیزش سہی۔ ظلم وستم کو تہذیب' ذرائع ابلاغ کے مکرو فریب کو فراست، فواحش کی تقریبات کو آرٹ، بت پرستی کو فنون لطیفہ، خیالِ خدا کو رجعت پسندی قرار دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

کیا عجب ہے کہ شاعر جب تعریفِ شعر سن کر مسکرائے اور ادیب کسی تقریب تعارف پر نظر میں چمک لائے، سیاست دان ہجوم کے پُرشور نعرے سن کر ہاتھ اٹھائے، عابد اپنے تقویٰ کی تعریف میں انکسار سے سر ہلائے، جنگجو اپنی دلاوری کے قصے سنا کر سینہ پُھلائے تو نفس خراب کار کو اپنا قریب ترین ہمسایہ پائے۔ اس کا آنا خدا کا جانا ہے۔ اس کی قربت خدا سے دوری ہے۔ جنت اور جہنم کا بُعد ہے۔ شیطان ورحمٰن کا تفاوت ہے۔ اہرمن اور اہورامزدا کے فاصلے ہیں۔ نور وظلمات کا تصادم ہے۔

شطرنج کے مہرے اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ان کی چالیں ایک ارب سے بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ نفس بھی اگرچہ معدودے چند بنیادی حیوانی اور انسانی مشترک جبلتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر اس کا باہمی جبلی اشتراک (Interplay) ان گنت ہو جاتا ہے۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ آج تک مجھے مقاماتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور فریب ہائے نفس کی کبھی سمجھ نہیں آسکی۔ تنہا جبلت کو بھی اپنی کارفرمائی کے لیے باقی جبلی محرکات کا اشتراکِ عمل چاہیے ہوتا ہے۔ خواہش اس کا حرکی عنصر (Drive Motive) ہے۔ انسان کی تعلیم کے ساتھ اس کا

عمل پیچیدہ تر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بنیادی اعتدال کے کنٹرول سسٹم سے باہر ہو جاتی ہے اور تخریب کاری ذات کا معمول بن جاتی ہے۔ نفس جھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ اپنے جھوٹ میں سچا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت سائنسی اور گی بندھی ہے۔ اس کے اصول واضح ہیں۔ حس بقا اخلاقی اقدار کو تسلیم نہیں کرتی۔ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اسے جن معاونین کی ضرورت ہے، وہ ازل سے اس کے ساتھ ہیں۔ نفس کے متبعین میں کوئی غدار نہیں۔ حسد، کینہ، بغض، غیبت، غیض و غضب، شہوات بلا تفریق نسل و مذہب ہر جگہ یکساں عمل پذیر ہیں۔ ان کی شدت اور قوتِ استعداد میں کمی ہو سکتی ہے مگر ان کی ہیئت مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان کا اشتراک قتل تک نہ پہنچے مگر حسد میں رحم کی کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔ خدائی صفات کے خلاف یہ انسانی صفات بندگی سے معذور ہیں۔ ان کا عمل محدود ہے اور نظر غیر آفاقی۔ ایک اہم بات وہ وقفہء سکیوت ہے جو جبلتوں کی عمل پذیری میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح ہر جبلّت فوری اشتعال اور تحرک کا مظاہرہ کرتی ہے اور ٹھہرنے کا کوئی وقفہ نہیں دیتی۔ انا اور تمرّد اور عزتِ نفس اس کی ہوا ہیں۔ عزتِ نفس شائد سب سے مشکوک اور بحث طلب ہے۔

کیا لطیفہ ہے کہ جملہ انسانوں میں عزت نفس ایک معتبر صفت سمجھی جاتی ہے، مگر دراصل یہ آسودگی اور احساس کمتری کی بنیادوں پر استوار شیشے کا محل ہوتا ہے۔ عزت نفس کے لیے ہمارے پاس کوئی معیار نہیں۔ اس کی بنیاد ہمارے بچپن سے لے کر عمرِ آخر تک کی کمی وبیشی کی تمام پیچیدگیوں پر ہوتی ہے۔ نفس جو مزاحمت اور موافقت اپنے حالات کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ وہی عزت نفس کا تخلیقی مواد بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں عزت نفس سنجیدہ

نفسیاتی مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ چہ جائیکہ اسے قابلِ وقعت قدر قرار دیا جائے۔ ابتدائی ادوار میں نفس قابلِ فہم ہے اور کم تعلیمی میں اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر جوں جوں انسانی تعلیم اور مہارتیں اور وجاہتیں بڑھتی ہیں، نفس بھی پیچیدہ تر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی تکنیکی صلاحیتیں گنجلک ہوتی جاتی ہیں۔ کسبِ علوم وفنون نئے نفیس تر اور مبہم اور پیچیدہ احساس تخلیق کرتا ہے اور نفسی ذاتی پسندیدگی کے ساتھ مل کر نفس کو احتساب سے بالا کر دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں آدمی کے تمام روحانی احکام و افکار بھی نفس کے استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عذر تراشی کی مہارت نفس سے زیادہ کسی میں نہیں۔ خیر و شر کی تمام قدار کو استعمال کرتے ہوئے تفاخر، برتری، نفرت وجود و خیال، نمائش پسندی، جاہ طلبی، اہمیتِ ذات، عقلی اور علمی ترفع، ہم خیال مصاحبت ذوق اور زبان کا سراب، مخلوق کے مابین فاصلے کا تعین، ذاتی محبوبیت کا تصور، مالی آسودگی، تخیر کی نمائش، مخصوص فنون کے ساتھ مخصوص شخصیاتی رویے تمدن اور تہذیب کے ہر انوکھے پن میں نفس انسان اپنی کارگذاری دکھاتا ہے، جسے تمام تر دانشوری کے باوجود جاہ طلبی پورے مغربی فکری ماحول میں فطری نتیجہ خیال کیا جاتا ہے اور اپنی کارگزاری اور کاریگری میں داد وصول کرنا اور اس کے لیے جد و جہد کرنا اعمالِ خیر میں سے ہے۔ مشرق میں تمام مراتب کے القابات اس کی واضح قسم ہے۔ کوئی عالم دین، کوئی مفکر اور کوئی ہنرمند ان القابات کا برا نہیں مناتا جو مبالغہ اور تعریفات پر مبنی ہوتے ہیں اور جو عقیدت مندوں کے نفسی مبالغے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

سنکی (Cynic) اور صوفی (Mystic) ان نفسی تجاوزات پر استہزا کی نظر رکھتے ہیں، مگر سنکی طنز و تشنیع کے باوجود اپنے آپ کو اس جلن اور کیفیتِ حسد و غیض سے نہیں بچا

سکتا جو نفس کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس صوفی اپنی کیفیات کو ایک بہتر فلسفہ حیات، علمی انکسار اور معتدل کیفیات سے زائل کر دیتا ہے۔ سکی نفس کی مخالفت ایسے بیمار کی طرح کرتا ہے جس کو کوئی صحت مند اچھا نہیں لگتا اور صوفی خدائی اُنس اور محبت کے سائے میں اپنی کسی فوقیت کو ذاتی نہیں سمجھتا اور خدا کا انعام سمجھتے ہوئے فوقیت و برتری کے ہر تصور کو ادھار سمجھ کر کبر و غرور سے بچ نکلتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قرض کی خدائی لمحاتی اور ناپائدار ہوتی ہے۔

نفس کے لیے زہر قاتل حسِ مزاح ہے جو اس کے تعزز اور تفوق کو ہم سطحِ زمین رکھتی ہے۔ حسِ مزاح تو کبھی نفس کا آلہ کار بن کر دوسرے لوگوں کی خامیوں اور خرابیوں سے محظوظ ہوتی ہے اور کردار اچھالنا، سکینڈل تخلیق کرنا، ذاتیات کا تجسس، تحقیرِ غیر سے تلذذ حاصل کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے، مگر جب یہ اپنی ذات کی طرف رجوع کرتی ہے تو ہمدردی ذات کا طلسم توڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور خود فریبی اور ارتکازِ ذات میں مورچہ زن اس نفسِ پُرکار پر مسلسل حملہ آور ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے اوپر ہنس سکتا ہے، وہ اس شخص سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے جو دوسرے پر ہنستا ہے۔ وہ اپنی حقارتوں میں سربلند رہتا اور اپنی وجاہتوں میں باخبر اور نگران، مگر نفس کا یہ نگران خیر و شر سے بالا، عزت و ذلت سے بے نیاز، کمی اور بیشی میں معتدل، صرف خدا ہی کی مکمل تائید سے پنپ سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فقیر کا منصب آرزو نہیں ہوتا اور عرصۂ آرزو طویل نہیں ہوتا۔ وہ صلاحیتوں کے مناصب اپنی طرف موسوم نہیں کرتا۔ ادھار پر حق ملکیت نہیں جتاتا۔ عرصہ حیات کو مستقل نہیں جانتا اور علم کا اول و آخر صرف حصول اعتدال سمجھتا ہے۔ یہ حسِ مزاح اسے اپنے ساتھ ہمدردی

سے روکتی ہے اور دوسروں کی خامیوں کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ہر انسان کو اس کے علمی استحقاق کے مطابق برداشت کرتی ہے۔ عجلت، بے قراری، حزن وملال کی جو کیفیات عصرِ حاضر پر محیط ہیں، اس کی واحد وجہ یہ خود احتسابی سے گریز، ہمدردی ذات، نفس انسان کی آسانی کی خواہشات اور بندگی کی بجائے خدائی کی آرزو ہے۔

زندہ اور فعال خدا سے انکار نہ بھی ہو تو بھی اس کی تسلیم، ہدایت اور نگرانی سے گریز کی تمام کوششیں ہمیں منتشر ذاتی اور خود غرضانہ افکار اور منفی طرزِ زندگی کی طرف لے جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ قتل وغارت، بے چینی، بے خوابی اور قوتِ حافظہ کا بحران ہے، جس میں دورِ حاضر مبتلا ہے۔

نفس فریب کار نہیں بلکہ بنی آدم کو جو مراحلِ امتحان پیش ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک جامد (Static) اور دوسرے متحرک (Moving and Shiftable)۔ ایک ٹیکنالوجی نفس میں مرتکز ہے اور دوسری شیطان کی سربراہی میں فعال ہے۔ نفس کی ٹیکنالوجی اس لیے جامد ہے کہ مقاصد کی جدت نہیں اور نہ اس طریقہ کار ہی کی جدت ہے۔ ازل سے ابتدائے انسان کے ساتھ نفس نے زندگیٔ جاوداں کی آرزو کے ساتھ انسان کو بہکایا اور شیطانِ رجیم نے اس آرزوئے نفس کو جنت کے مکانی اور زمانی پہلو میں تحرک دے کر آدم کو اللہ کی ہمسائیگی سے دور کر دیا۔ نفس وہ بنیادی زمین فراہم کرتا ہے، جہاں شیطان شرارت کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر ایک شہوتِ خبیثہ تناور درخت بن جاتی ہے۔ یہ ایک زہریلی گھاس ہے جو عقل و معرفت کی توانا فصل کو برباد کر دیتی ہے۔ نفس کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ذہنِ انسان ہے۔ رب کریم کے احکام

اور نصائح سے کم علمی اور تغافل ہے۔ اللہ ایک عظیم اور برتر استاد کی طرح جو اختیار انسان کو دینا چاہتا ہے، اس میں جبر سے کام نہیں لیتا۔ اس کے لیے یہ آسان تھا کہ تمام انسان ہدایت یافتہ ہوتے۔ کسی کو مجالِ گستاخی نہ ہوتی۔ حوصلۂ انکار تو درکنار جرأتِ سرتابی کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ مگر یہ مقصدِ تعلیم صحت مند نہ ہوتا۔ تعلیم کا مقصد ہی صلاحیتِ انتخاب پیدا کرنا ہے۔ کسی کو صلاحیت انتخاب دے کر اس پر فیصلہ عائد کرنا ناانصافی ہے اور اللہ یقیناً ناانصاف نہیں۔ جہاں انسانی ذہنی آراستگی کے لیے بے شمار امدادی اور ترغیباتی طریقے بہم پہنچائے گئے، وہاں نفس کے اندر بھی احساسِ زیاں کا تأسف رکھا گیا۔ کبھی نہ کبھی انسان کو احساسِ زیاں اور توجہ سے آشنا کر کے اس کو دوبارہ صحت اور اعتدال کو پلٹنے کا موقع دیتا ہے۔

مختصر یہ تمام افسانہ انسان اللہ کے نزدیک تین ہی درجات پر مشتمل ہے۔ غلطی یا گناہ، احساسِ گناہ یا توبہ اور مغفرت ----- پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جس کو اپنی خطا کا علم ہو، توبہ کی قبولیت کا بھی، پھر بھی وہ اپنا خسارہ پورا نہ کرنا چاہے۔ یہ وہ ظلم و جہالت ہے جس کی طرف اللہ نے امانتِ عامیہ میں اشارہ کیا ہے۔ جسمانی مشقتوں سے نفسِ انسان کو اذیت دے کر اسے درستگی کی طرف مائل کرنا، کم از کم اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ مشقت بذاتِ خود ایک عداوت بن جاتی ہے اور اپنے مخفی تکبرات رکھتی ہے۔ جان کو ہلاکت میں ڈالنا ایسا مرغوب فعل نہیں کہ جس کے نتیجے میں اللہ کی ہمسائیگی یا قرب نصیب ہو۔ اس طرح تو کولہو کا بیل سب سے بڑا صوفی اور خدا شناس ٹھہرے گا۔ نفس ذہنی جبریت کو جھوٹے دعاوی میں ملوث کر دیتا ہے اور جبریت کو بھی شیطنت کا ایک جزو بنا دیتا ہے۔

اللہ بہر حال انسان کو جانورانہ تخلیقات سے بہتر سمجھتا ہے اور عقل کو تخلیقات میں فوقیت دیتا ہے۔ غور و فکر ہر انسان کو آزادانہ انتخاب کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔ نفس جہاں عارضی ترجیحات کے دام پھیلاتا ہے، پہچان فطری اور معتدل کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔

نفس کی ایک کمزوری ہے جس سے اہلِ عقل ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وہ کمزوری ہے جس سے اس کو معتدل کیا جاتا ہے یا اس کے عادات کا توڑ اور روکا جا سکتا ہے۔ نفس کو ہر خواہش سے بڑھ کر اس کا تجسس ہے۔ یہ ہمہ وقت سونگھنے، چکھنے اور جاننے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ حیرتوں کی اسے تلاش رہتی ہے۔ نئے پن کا حریص ہے۔ انفرادیت کا شائق ہے۔ یہ شوق اسے تعلیمِ دنیا کو بھی لے جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے خدا کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس کے تجسس کو استعمال کر کے تعلیم و تربیت میں اضافہ کر کے اسے عمومی اور کم تعلیم یافتہ لوگوں سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس وحشی درندے کی طرح ہے جس کو سدھانا کارے دارد مگر عمومی طور یہ مظاہرہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شیر، بھیڑیا، کتا، سانپ بھی پالتو جانور کی طرح رکھا جا سکتا ہے۔ سرکس کے جانور کی طرح سزا اور جزا کے عمل سے اس میں مخصوص تہذیب جنم لے سکتی ہے۔ آغازِ تربیت میں نفس خواہش کے باوجود اپنی ابتدائی خصلتوں کے تحت بغاوت بھی کرتا ہے اور بار بار اپنی عادات کو دہراتا ہے۔ ابتدائے تربیت میں اس کا مقصد کسی بہتر اور برتر خیال کا حامل نہیں ہونا چاہیے، مگر تجسس اسے تحقیق اور محنت پر آمادہ کرتا ہے۔

تربیت اور نئی عادات کے اختیار کے بعد یہ اپنے آپ کو منفرد اور ممتاز کرنے کے

لیے دوسروں سے مختلف ہونا پسند کرتا ہے۔ علم اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ اس نئے پن سے اُنس اور محبت پیدا کرتا ہے اور اسے ایک اختیاری مستقل عادت کی طرح اپنا لیتا ہے۔ یہ وہ منزلِ فکر ہے جہاں اسے خدا سے اُنس کے حصول کی خواہش پڑتی ہے۔ نئی دنیا کے افکار اور نئے آفاق کی تحقیق پھر اسے شوقِ اختیاری ترک نہیں کرنے دیتی۔ اگرچہ اس کی جبلتیں ہر لحظہ کوشاں ہوتیں کہ دوبارہ اسے دورِ جاہلیت کو پلٹائیں۔ مگر نئی عادت اور خدا سے رہِ خدا پر مستقیم رکھتی ہیں۔ اللہ کی تائید اور رحمت سے پھر نفس انسان پر سکینت اور الہام کا نزول ہوتا ہے۔ یہ وہ نعمت غیر مترقبہ ہے جو نفسِ انسان نے پہلے کبھی نہیں پائی ہوتی۔ اب اس کے مقصدِ حیات واضح اور خیال مصفا ہو جاتے ہیں۔ شعور اپنی بلوغت کو پہنچتا ہے، مگر اس مرحلے کے اپنے خطرات موجود ہیں۔ تقدس، تقوٰی کی مبالغہ آمیز خواہش تزکیہ کی شدتیں اسے دعوٰی اور خصوصیت کی حرص کا شکار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر اس منزلِ فکر میں اللہ کی محبت اور اخلاص کے سوا کوئی شے معاون نہیں ہوتی۔ اللہ کی محبت اور اطاعتِ رسول ﷺ ایسی منزل کے رہنما ہیں۔ اطاعت رسول ﷺ محض عملی اور نقلی نہیں، اطاعت میں محبت اور اقدار کی مکمل مفاہمت چاہیے۔ ایمان کے تین درجاتِ حلاوت بڑے واضح ہیں۔ اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی، اللہ کے رسول ﷺ کے لیے ہی دنیاوی جذبے اور ملکیت سے زیادہ اُنس اور جبلی اقدار کو جو کفر کے مترادف ہے، واپس پلٹنے کا خوف نفس اس مقام تربیت سے کسی حال میں واپس پلٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور دنیا اور آخرت میں اسے بخشش کی خبر سنائی جاتی ہے۔

”اے نفسِ مطمئنہ راضی بر رضائے خدا ہو کے پلٹ، بندوں میں داخل ہو، جنتِ

پروردگار میں داخل ہو----''

حکیمِ نفس ہونے کا کوئی بھی دعویٰ نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ عموماً تین ادوار کی عادات پر محیط ہوتا ہے۔ ہر نفس جینیاتی خصائل، فوری پدرانہ عادات اور ذاتی تحصیل کردہ صلاحیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ آخری دو صورتیں زیادہ نمایاں اور قابلِ گرفت ہیں مگر پہلی اور صدیوں پرانی فطرت ایک ناقابلِ تسخیر دشمن بن جاتی ہے۔ صوفی اپنی آخری جنگ اپنی فطرت سے لڑتا ہے۔ کھلے اور چھپے دشمن کے خلاف یعنی نفس اور شیطان کے خلاف صرف خدا ہی اپنی بنائی ہوئی فطرت میں تصرف کرسکتا ہے۔ صرف توفیقِ الٰہی اور محبت ہی اس منزل کی فاتح ہے۔

علم برائے زندگی، علم برائے علم اور علم برائے شناختِ ذات، تحصیلِ علم اپنے تین مدارج میں ممکن ہے۔ جہاں پہلے دو مدارجِ علمیہ کے مقاصد واضح مگر تیسرا مبہم ہے۔ آپ شناختِ ذات کیوں چاہتے ہیں اور اس کا محرک کیا جذبہ ہے۔ کیا تجریدی تصورات کی تلاش شناحتِ ذات ہے؟ کیا فلاسفہ کا انکسار ان کی غور وفکر کی عادت دنیاوی معاملات سے اعراضِ ہر تعلیم، تفکر، خود بینی ہی شناختِ ذات ہے اور اگر یہی ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسان نے آخری درجۂ فکر تحصیل انسانیت کے لیے وقف کیا ہو، مگر پھر انسانیت اور بہتر انسان کی تعریف کون کرے گا۔

کیا کسی نے اس ضمن میں تصورِ الہیات سے بے نیاز ہو کر بھی کوئی معیار مقرر کیا ہے؟ زمان و مکاں میں جبریت کا قائل ہونے کے بعد اخلاقیات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ کیا شناختِ ذات کا یہی مطلب تو نہیں کہ نسلِ انسان نے جن کوتاہیوں کو ترقی اور تمدن کے لیے مضر سمجھا، ان سے بچنا ہی آئیڈیل ٹھہرا۔۔۔ یا عمومی طرزِ زندگی اور فکر سے انحراف ہی شناختِ ذات کا حصول ہے۔ جب تک شناختِ ذات کا مقصد طے نہ ہو، اس کا رتبہ فکر

غیر واضح، مبہم اور نا قابل تسلیم ہے۔ اس درجہ پر انسان مجذوب، سنکی اور مادر پدر آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف مذہبی اور صوفیانہ مسالک میں شناختِ ذات انتہائی اہم اور بامعنی جزوفکر ہے اور ایک یقینی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ غور وفکر کے اوصاف پا کر اور تجربہ و تکلیف سے گذر کر انسان اپنی تمام تحصیلات کے باوجود محسوس کرتا ہے کہ وہ اطمینانِ قلب سے تہی ہے۔ کسی بھی مذہب اور فلسفہ خیال میں اطمینانِ قلب، دنیاوی سکون سے جداگانہ قدر ہے۔ تمام قسم کی آسائشات وتفریحات کے باوجود اطمینانِ قلب کا مفقود ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس خصوصی کیفیت کا مزاج، وجوہ محرکات اور تحصیل کے طریقے جدا ہیں۔

شناختِ ذات ہی اگر اعلیٰ ترین ذہنی منزل ہو تو غالباً یہ صرف ایک ذاتی کیفیت ہوگی جس کا تعلق معاشرے اور مذہب سے نہ ہوگا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تمام وجدانی کیفیات نا قابلِ انتقال ہیں۔ یہ تجربات ایک شخص سے دوسرے شخص تک یا ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک منتقل نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ کیفیات نہیں جنہیں مسمیریزم (Mesmerism) یا ہپنوسس (Hypnosis) کے ذریعے کسی دوسرے میں ارسال کیا جا سکے۔ پھر شناخت ہمیں کہاں پہنچا سکتی ہے۔ غالباً مغربی مفکرین کی انسانیت نوازی یا انسان دوستی اس کا انجام ہے۔ شناختِ ذات کے بہترین مفسرین بھی اس سے بہتر کوئی انجام نہیں رکھتے۔ مگر اتنے بے شمار انسانیت نوازوں نے انسان کو کون سے ایسے اسبابِ سکون و اطمینان مہیا کر دیے ہیں کہ ہم انہیں زندگی اور معاشرہ کے قانون ساز قرار دے سکیں۔ شناختِ ذات اپنے لیے ہو تو یہ کسی بھی معاشرہ کے لیے قانون ساز کی حیثیت نہیں رکھتی اور پھر انسانیت نوازی کے لیے بھی شناختِ ذات ضروری امر نہیں ہے۔ بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جو فلسفیانہ

گہرائیوں اور تحلیل نفسی کے بغیر بھی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف ہیں اور اپنی ذات کے لیے اجنبی ہیں۔ محض شناخت تو کہیں بھی ایسا آئیڈیل نہیں ہے کہ جملہ انسان اس کو مقصودِ علم و زندگی سمجھیں۔

دراصل شناختِ ذات ایک ایسی آرزو اور طلب کے نتیجہ میں وجوو پاتی ہے، جہاں انسانی توجہ کسی اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کے لیے اپنی عمومی زندگی کو نا اہل پاتی ہے۔ وہ لوگ عرفانِ حق کے متلاشی ہیں۔ ان کو احساس ہوتا ہے کہ عقل و وجدان کی منزل ماورائے مادیت ہے اور وہ چاہے خدا کے قائل نہ بھی ہوں، اس تحقیق پر مائل ہوتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کے اس بنیادی مسئلہ کو حل کرسکیں۔ شناختِ ذات اس خوف سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ معمول کی زندگی میں ہر انسان ایسی نفسیاتی اور باطنی الجھنوں کا شکار رہتا ہے کہ ہر کیفیت اور ذہنی بحران اس کی تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہو کر منزل کے حصول میں ناکام رہ جاتا ہے۔ شناختِ ذات کا مطلب مملکتِ جبلت پر عقل و شعور کی قوتوں سے حملہ آور ہونا ہے اور ذات کی انارکی اور تخریب کو اس درجہ قابو میں لانا ہے کہ کسی بہتر شعوری مقصد میں حائل نہ ہو۔ بطنِ مادر سے خروج کے وقت سے ہی جو اعصابی زلزلے ذہن اور وجود پر طاری ہوتے ہیں، وہ لحد تک احساسات کا ایک تسلسل قائم کرتے ہیں۔ مدافعت اور کشمکش کے اس عمل میں بقاء اور تہذیب کا برابر کا ساتھ ہوتا ہے۔

مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عمل میں جبلتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ ایک غیر متناسب توازن جسے آپ نفسیاتی توازن کہہ سکتے ہیں، بیشتر لوگوں میں قائم ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال

ہے کہ وہ ایسے بنے ہوئے ہیں (We are made so)۔ جنون اور شدت پسندی سے کچھ ادھر لوگ اس توازن کو ایک مستقل قدر قرار دے کر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمدردیٔ نفس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ معدودے چند اس حالت پر مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ توازن نہیں ہے اور اس لیے وہ کوشاں رہتے ہیں کہ اس توازن کو حاصل کریں جس کی واحد تعریف اللہ نے کی ہے۔ نفسیاتی توازن اور اللہ کے توازن میں بُعد المشرقین ہے۔ نفسیاتی توازن صرف انسان کی کارکردگی کو اپنا مقصد ٹھہراتا ہے۔ وہ ایک ایسا ظاہری توازن ہے جس میں جنون اور افسردگی فرد کو سوسائٹی سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی اور عواملِ زندگی میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔ نفسیاتی اعتدال کا مطلب ایک جیسی زندگی ہے۔ یکساں طرز عمل اور یکساں اعمال اور خواہشات ہیں۔ مگر اللہ کی طرف سے توازن کی تعریف داخلی اور خارجی ہم آہنگی، بحران اور انارکی سے آزادی ہے اور ایسا طرز عمل جو شائد اکثر لوگوں کو عجیب لگے۔ اللہ نے توازن کی تعریف مختصر کی ہے۔ اطمینانِ قلب اور خوف و حزن سے نجات، بظاہر بات قابلِ فہم اور آسان ہے مگر بغیر شناختِ ذات کے یہ امر محال ہے۔ توازن کے لیے بھی کسی منزل کا تعین ضروری ہے۔ یہ آئیڈیل کیا ہے۔ شائد فلاسفہ مغرب اور لادینی نقطہ نظر اس کا کبھی قائل نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لیے اپنی ذات کو درست کرنے کا عزم ایک مفروضہ اور جنتِ خیال ہے مگر اپنی ترجیحات کے تعین کے بغیر شناختِ ذات کبھی بھی قابلِ حصول نہیں۔

خدا کا ماننا، نہ ماننا تو سوال ہو سکتا ہے مگر خود شناسی کا کوئی مقصد سوچنا بھی محض تضیع اوقات ہے۔ شناختِ ذات سے پہلے کی منزل کو علم الیقین کہتے ہیں۔ ذہنِ انسان جب اولیں مقصد کے یقین تک پہنچتا ہے تو وہ دو راستوں میں ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ یا تو شیطان

کی طرح حضور یزداں بھی ذاتی تفاخرات سلامت رکھے اور دجل وفریب سے کام لے کر خدا کے احکام سے انکار کرے یا اخلاص اور محبت کے ساتھ اپنے مالک وآقا کی خدمت میں اپنی ذات کو استوار کرے۔ اصلاحِ نفس پر مائل ہو اور قربتِ خدا کی آرزو کرے۔

دوسری طرزِ فکر ہی کو تصوف کہتے ہیں۔ اسی فکر کے تحت انسان یہ شدید خواہش رکھتا ہے کہ ان افکار اور اعمال کی اصلاح کرے جو محبتِ خدا میں حائل ہیں۔ وہ اپنی ذات پر اس خواہشِ خدا کو نگران مقرر کرتا ہے اور ہمہ وقتی احتساب میں مصروف رہتا ہے۔ طاقت ور جبلتوں کو زیر کرنا آسان نہیں۔ نفس اپنی عادات کا بار بار اعادہ کرتا ہے۔ توبہ اگرچہ تدارک ہے مگر بقولِ امام جعفر صادق، ‘‘توبہ آسان ہے، ترکِ گناہ مشکل۔’’ توازن کی اس کمی کا احساس شناختِ ذات کا بنیادی محرک ہے اور مسلسل یہ فکر کرنا کہ میری کوئی عبادت یا تکرارِ عادت مجھے خدا سے دور نہ کردے۔ یہی دراصل شناختِ ذات کی کیمیائی ترکیب میں شامل ہے۔ تزکیہ جسم یا ریاضتِ ذہن دونوں ہی اس کوشش میں شامل ہیں۔ جسم بغیر شعور ہر مشقت کو عظمت سمجھ لیتا ہے اور تزکیاتی اور مراقباتی کوشش نفس کی فریب کاری کا حصہ بن جاتی ہے۔ قرآن ہی دنیا کی واحد کتابِ علم ہے اور وہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کو عطا کی گئی۔ بہترین علم کا بوجھ کسی ابنارمل یا سب نارمل انسان نے نہیں اٹھایا بلکہ ایسے انسان کو عطا کیا گیا جسے مکمل اعتدال کا مظہر بنایا گیا۔ یہیں سے اللہ نے تحصیلِ علم کا اصول قائم کیا۔ جس کا علم زیادہ ہوگا، وہی زیادہ معتدل ہوگا۔ مگر علم کی بے راہ روی مراد نہیں۔ اگر کچھ لوگ علم کی شاخ میں دوسروں سے ممتاز ہیں تو یہ کوئی بڑا کریڈٹ نہیں ٹھہرتا۔ جب تک وہ علم کی اولیں ترجیح کے مطابق اپنی شناختِ ذات کا مقصد متعین نہیں کرتے۔ اعتدال تک رسائی تبھی ممکن ہے

کہ اللہ کے علم میں اپنی ذات کی آگہی حاصل کی جائے اور عادات نفس کے مبالغہ کو کم کیا جائے، تاکہ زندگی کے کسی مقام پر یہ آپ کے اور شناختِ خدا میں حائل نہ ہو سکے۔ علم ہی تقویٰ ہے اور تقویٰ اعتدالِ عادات ہے۔ ہوسکتا ہے آپ وقتی اعتدال حاصل کر لیں مگر جب تک مسلسل نگرانی نہ جاری رہے گی، نفس کسی بھی وقت اپنے خصائل کا اعادہ کر کے آپ کی متوازن شخصیت کو بحران سے آشنا کر سکتا ہے۔

خودشناسی خودفریبی بھی ہوسکتی ہے۔ خودشناسی کا معیار کبھی ذاتی نہیں ہوسکتا۔ ہر سائنس کے سپیشلسٹ (Specialist) کی طرح نسلِ انسان میں بہت سے لوگ اسی کوشش میں مراد پا گئے۔ پیغمبرانِ عالی مقام نے جس کردار سے اس کی وضاحت کی، اس کو کسی بھی صورت ترک نہیں کیا جاسکتا اور اولیائے کرام کی طرزِ حیات اس کی گواہ ہے۔ عمومی جہالتِ فکر نے تصوف کو عمومی زندگی سے جدا کر دیا، مگر پھر اگر دوسرے علوم کو بھی دیکھا جائے تو ہر انسان باقی علوم میں یکساں اہلیت نہیں رکھتا۔ اور کچھ ہی لوگ اس مقام میں شناخت پر پہنچتے ہیں کہ ان کو سند سمجھا جا سکے۔ پھر تصوف کیوں غیر معمولی ہو؟ دیکھا جائے تو صوفیاء اور اولیاء کی تعداد ان تمام سائنسدانوں اور فلسفیوں سے زیادہ ہے جن کے نام سے انسانی فکری ترقی منسوب ہے، مگر فرق یہ ہے کہ وہ معاشرے کے لیے اس رحم و کرم کا باعث نہیں بنتے جس طرح ایک پیغمبر یا صوفی بنتا ہے۔ ان ماہرینِ ذات اور خدا کی وجہ سے معاشرہ تہذیبِ حاضر تک پہنچا ہے۔ ہر زمانہ میں جبلت کی فریب کاری جملہ عمومی انسانوں کو مبالغہ اور انارکی اور انتشارِ ذہن کا اسیر کرتی رہیں اور ہر زمانہ میں ماہرینِ شناختِ ذات اور شناختِ خدا انسان کی بقا اور انسانی معاشرہ کے اعتدال کا باعث بنتے رہے۔ قیامت اس وقت ہے جب

زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود نہ ہوگا۔ باقی علوم کے ماہرین تو شاید رہیں مگر ان میں کوئی بھی انسانی بقاء کے لیے ضروری نہیں۔

سائنسدان اگر چند مادی سہولتوں کا باعث ہیں‘ تو دوسری طرف حیاتِ انسانی کی مکمل فنا کا سامان کر چکے ہیں۔ ان میں کوئی نسبتِ اعتدال نہیں ہے۔ بقا اور فنا کے اسباب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دس ہزار سال کی معلوم انسانی تہذیب دس منٹ کی تخریب کاری کی نذر ہو سکتی ہے۔ فلاسفہ کبھی بھی اس قابل نہیں ہوئے کہ انسانی معاشرے کی قیادت کر سکیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر اعتدال کی تعریف پر بھی پورے نہیں اترتے۔ شناختِ ذات کے حوالے سے کسی سائنسدان اور فلسفی کی کوئی تفصیل ہمارے پاس موجود نہیں۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں جس سے ہم خیال و عمل کے توازن کا سبق پڑھ سکیں۔ کوئی بھی تو نہیں جو ہمیں مرتبہ سکون و اطمینان تک پہنچا سکے۔ بے اطمینانی، بے چینی اور بے خوابی کا بحران بتا رہا ہے کہ سائنس اور فلسفہ ان مسائل کا حل نہیں۔ شاید شناختِ ذات کے ماہرین کی شدید کمی محسوس ہو رہی ہے۔ شاید ایک اور بھی وجہ ہے کہ اس علم کو بھی خودرو بیلوں کی طرح بے شمار جعلسازوں نے چاٹ لیا۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ، شہر شہر ان مدعینِ تصوف کے انبار لگے ہیں‘ جو تصوف کے نام کے سوا اس علم سے مکمل بے بہرہ ہیں۔ یہ جعلساز (Quacks) نہ خوفِ خدا سے آشنا ہیں نہ خوفِ خلق سے۔ مکر و فریب کا نیا استعمار تعمیر ہو رہا ہے اور بدقسمتی سے اس مرتبہ اس کی زد میں مذہب ہے، اسلام ہے، چاہے وہ بش بلیئر ہوں یا محلّہ کا تعویذ ساز۔ مسجد کا ملاّ یا گدی نشین ہو یا مکاتب کے تراشیدہ سر عالم۔

عہد قدیم کی اساطیر کے محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین اگرچہ اپنے اندازے کے مطابق ان معاشروں کی بود و باش، طرز معیشت اور معاشرت کا سراغ لگانے میں کوشاں ہوتے ہیں اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے ابتدائی انسانی معاشرے کی ترقی اور ان کے ذہنی مدارج کا تعین کرتے ہیں مگر ایک ضروری بات سے جان بوجھ کر گریزاں ہوئے۔ تحقیق و جستجو اور حقائق پرستی کے عنوان سے وہ اپنی تمام تلاش کسی بھی الہامی اور مذہبی امکان سے خالی رکھتے ہیں۔ وہ ان معاشروں ہی کے پروہت اور مندر اور رسم و رواج کا تو تفصیلاً ذکر کرتے ہیں مگر کسی بھی ہدایت کے اعتراف سے گریزاں ہیں جو شاید بالائے زمین کسی تخلیق کار سے جاری ہو رہی ہوتی ہے۔

ابتدائی معاشروں میں وہ مذہب کو انسانوں کے اندرونی خوف و ہراس، کم فہمی کے بحران کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ دورِ اصنام سے پیچھے انہیں جانے کی جسارت نہیں ہوتی۔ اصولاً ہر سلسلہ اصنام کے پس پردہ وحدانیت جھانکتی نظر آتی ہے۔ قریباً تمام معاشروں میں بت پرستی، خدائے واحد کی عبادت کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ یونانی دیومالا میں اگر غور سے

دیکھا جائے تو زیوس Zeus اور ہیرا کے خاندان سے پہلے اور کوہ اُلمپس کے جملہ دیوتاؤں کے پس منظر میں ہیں۔ ایک عظیم دیوتا کرونس (Cronus) نظر آتا ہے جو اولاد کو کھالیتا ہے۔ واحد وجہ یہ نظر آتی ہے کہ جب تک خدائے واحد کا تصور قائم رہا' بت پرستی اور اصنام سازی سختی سے ممنوع رہی اور اُس دور کے پیغمبر اور پروہت مافوق کائنات ہدایات کے تحت خدائے واحد کی پرستش کرتے رہے اور اصنام پرستی سے اجتناب بھی کرتے رہے۔ یہی حال ہم ہندو علم الاصنام میں دیکھتے ہیں' جہاں آریائی خدائے واحد اندرا کے ساتھ داخل ہوئے جو سورگ اور برقِ صاعقہ کا خدا ہے۔ میدانی ثقافت میں داخل ہوئے۔ خدائے واحد کو ورونا اور متھرا کی تثلیث سے ملوث کر دیا گیا۔ اس طرح دوسری تثلیث میں برہما ہی خدائے واحد اور مطلق ہے۔ منو کی وضاحت کے مطابق وہ لاشریک لہٗ ہے، مگر اس کی صفات کو پھر علیحدہ خداؤں یعنی شیو اور وشنو کے مراتب دیئے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام علم الاصنام خدائے واحد ہی کی حکومت پر ختم ہوئے ہیں' مگر شاید اس کو ناقابل رسائی دیکھ کر کج فہم اور کج رو پروہتوں نے مال واسباب کے لالچ میں ایسے اسباب سفارش ڈھونڈے جو خدائے واحد کی مطلق حکمرانی کو تقسیم کر سکتے۔

طوفانِ نوحؑ تقریباً ہر قدیم دورِ اصنام میں موجود ہے۔ قرآن، انجیل، توریت اور صحائف میں اس کی تصدیق ایک ایسے عالمی سیلاب کی حیثیت سے کی گئی ہے جس کی زد سے کوئی کافر اور مشرک نہیں بچا۔ کشتیِ نوحؑ کے مسافر ہی اس عظیم حادثۂ زمین کے قصہ کو رہ گئے۔ ایک بات یقینی ہے کہ یہ سیلاب عظیم محض میسوپوٹیمیا میں نہیں گذرا اور نہ محض دجلہ و فرات کی مقامی طغیانی ہی کا نتیجہ ہے۔ اس سیلاب کے نتیجہ میں نوحؑ کے بیٹے تمام زمین پر

پھیل گئے اور تہذیب دنیا ان حدود تک بھی پہنچی، جہاں آج کا انسان موجود ہے۔ اگر یہ عام طوفان ہوتا تو اس کی اطلاع تمام اساطیر میں نہ دی جاتی، جو قریباً ہم زمانہ اور ہم مشرب ہیں۔ یہ تو مانا جاسکتا ہے کہ بعد میں معاشروں کے اختلاط سے یہ داستانیں تمام قوام نے اپنا لی ہوں، مگر اتنا پہلے بھی نہیں کہ منو بھی اس کی بات کرے اور گلگامش کی داستان میں اس کا ذکر ہو اور سکینڈے نیویا کے علم الاصنام بھی اسی ذکر سے معمور رہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طوفان کے حقائق کا سراغ صرف ان لوگوں سے ملتا ہے جو کشتی نوح کے مسافر تھے۔ پھر اگر یہ عام طوفان ہوتا تو تمام دنیا کے جانور اکٹھے کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ خاص طور پر وہ مضر جانور جنہیں انسان نے کبھی دوست نہیں جانا۔ کشتی نوح پر سانپ اور بچھو پالنا انسانی فراست کا ثبوت نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طوفان ایک عالمی طوفان تھا اور اللہ اپنے پیغمبر کے ذریعے تمام تخلیقی اقسام کا تحفظ چاہتا تھا۔ چاہے وہ انسانوں کے دشمن تھے یا دوست۔

اس حادثے کی مقامی اطلاع صدیوں کے بعد دوسرے معاشروں کو پہنچی یا پھر کسی اور معاشرے کو کیا ضرورت تھی کہ جو واقعہ انہیں پیش نہیں آیا، اس کو بڑے اہتمام سے اپنی مذہبی روایات کا حصہ بناتے۔ محض ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ باقیاتِ نوحؑ میں یہ عظیم واقعہ ایک ایسی تاریخی حقیقت تھا جو نسلِ انسان کے لاشعور میں ایسے خوف کی طرح ڈھل گیا تھا کہ آنے والی نسلیں بھی اسے فراموش نہ کرسکیں یا یہ پھر خدا پرست بزرگوں نے تنبیہ غافلین کے لیے، آنے والے لوگوں کے لیے نقل کیا تھا کہ گمراہیٔ عقل کے لیے حیرت کا نشان بنے۔ اس حادثہ کے بعد دو بڑے نتائج نکلے۔ نسلِ انسانی کا پھیلاؤ اور ایک مخصوص وادی سے نکل کر اولادِ نوحؑ زمین کے گوشے گوشے میں جا سکی حتیٰ کہ لامتناہی برف زاروں

میں اسکیمو (Eskimo) بھی آباد ہوئے۔ اور دوسرے یہ کہ کافی عرصہ تک خدائے واحد کی پرستش تمام انسانی معاشروں کا شعار رہی۔ ماقبل تاریخ پر ابھی ہماری نظر صرف دور اصنام تک محدود ہے۔ اگر ہم اس میں بھی کچھ بڑھ جائیں اور ہماری نظر تاریخِ اصنام کے دور سے آگے بڑھتی تو حقیقت نظر آجاتی۔ موجودہ تہذیبِ معاشرہ کی ابتدا (Neolithic) یا سٹون ایج (Stone Age) کے دوسرے دور سے شروع ہوگئی تھی۔

اس حقیقت سے بھی گریز نہیں کہ تمام ابتدائی معاشرے پروہتی معاشرے ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب انسان بقا کے ذرائع تلاش کر رہا تھا۔ مذہبی شعور ایک غیر معمولی عنصر ہے، جس کی کوئی ذہنی توضیح نظر نہیں آتی۔ موت کا خوف بھی نہیں، کیونکہ عملی طور پر جب ایک اصول زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو اور ہر طرف موت و حیات کے اصول جاری ہوں تو ذہن ڈرنے کی بجائے انہیں صرف بھول جانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ کسی دوسری دنیا میں بقا کا تصور، تخلیق کار کا خوف اور فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی سوچ غیر ترقیاتی انسانی ذہن میں امر محال ہے۔ اس دورِ جدید میں بھی انتہائی ترقی یافتہ ذہن زندگی ہی کو آخری منزل قرار دیتا ہے اور بہت سے دانشوروں کے نزدیک مذہب اثبات کے تصور اور بقا کی خواہش ذہنی عوارض قرار دیے جاتے ہیں۔ سوائے اس کے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس وقت کے معاشروں کو کوئی خارجی ہدایات موصول ہوئیں اور کسی خارجی قوت نے ان کی ذہنی نشوونما میں حصہ لیا اور دور بقا کے مادر پدر آزاد معاشروں کو ذہنی تربیت کے اسباب مہیا کیے۔

زمانہ قدیم کا انسان جانور سے علیحدہ تو نظر آتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ ان کا کوئی

فرد اس وقت Rocket Engineering میں پی ایچ - ڈی کر رہا ہو۔ سُست رو اور کاہلانہ تعلیمی عمل اس وقت موجود تھا۔ وہ برسوں پر نہیں بلکہ ان گنت صدیوں پر محیط تھا اور انسان کا ذہن ہمیں اس بچے کی طرح نظر آتا ہے جسے ہاتھ پکڑ کر ہی چلایا جا سکتا ہے یا پھر فہمائش اور تنبیہ سے سبق پڑھایا جاتا ہے۔

یوں تو زندگی کے تمام نقش و نگار انسان کو عزیز ہیں مگر زندہ رہنا عزیز تر ہے۔ سنا ہے کہ جنت سے خروج کا باعث ہی دوامی زندگی کی آرزو اور لالچ تھا' جسے شیطان نے استعمال کر لیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی دائمی زندگی کی خواہش ماند پڑ گئی کہ حقیقتوں کے تلاطم میں انسان ابدیت کو رومانی اور احمقانہ تصور سمجھنے لگ گیا ہے۔ ابدی زندگی کی آرزو کی جگہ اب صرف ایک بار جینے'(You only live once) کا تصور غالب آ گیا ہے۔ جینے کے بعد ایک ہی حقیقت یقینی ہے اور وہ یہ کہ ایک دن مرنا ہے۔۔۔ زندگی سے موت تک ذہنِ انسان ایک ہی قسم کے طریقِ کار کا قائل ہے۔ بچپن کو موت سے واسطہ ہی نہیں اور جوانی موت سے بے پرواہی کا مظاہرہ کرتی ہے اور بڑھاپا خوف مرگ کے سوا کسی اور مستقل خوف سے آشنا نہیں۔

ایک بار کے جینے کے تصور میں خودکشی ایک نارمل احساس لگتا ہے۔ آخر کیا

ضرورت ہے کہ انسان اپنی بدقسمتی اور بے نصیبی اور غم و الم کو ایک موہوم سی امید پر زندہ رکھے۔ غربت و افلاس کی ماری ہوئی طویل زندگی میں رہائی کا احساس اتنا عجیب نہیں لگتا۔ زندہ رہنے کی خواہش بہت اہم سہی۔ اندوہناک زندگی کا تسلسل کسی طور قابل برداشت نہیں ہوتا۔ پھر اگر کچھ لوگ اس زندگی کو پورے ہوش و حواس سے ناقابل گذر سمجھتے ہوئے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیں تو شاید اتنا حیران کن بھی نہیں لگتا۔

اجتماعی نہ سہی مگر انفرادی سوچ اس طرف ضرور مائل ہو سکتی ہے اور یہ ابنارمل رویہ نہ ہوگا۔ دیکھا جائے تو اس سوچ کو بھی مذہبی امید اور خوف کی کیفیتیں ہی روکتی ہیں۔ مذہب جو موت کے بعد ایک طویل زندگی کی بشارت دیتا ہے یا غیر ذمہ دارانہ رویوں کی سزا سناتا ہے۔ اللہ ہی زندگی اور موت میں سب سے بڑا مرکز امید ہے۔ اللہ جو زندگی میں انسان کی ذمہ داری بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور مرنے کے بعد حیات ابدی کی خبر سناتا ہے اور رحم و معرفت کی امید دیتا ہے اور سرمدی خوشیوں کی جنت کی عطا کا ذکر کرتا ہے۔ عمومی جائزہ بھی لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یا تو انسان بہت بڑا خوش فہم ہے جس نے موت کو فریب دینے کے لیے خدا اور بعد از ممات زندگی کا تصور تخلیق کر لیا ہے یا پھر کسی کائناتی الہام اور مشاہدات نے انہیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ دراصل یہ دنیا وسعتِ زماں میں ایک ناقابلِ رجوع وقفہ ہے اور یہ کہ موت صرف ایک عارضی حادثہ ہے جس کے بعد ہم کائنات کی طویل ترین زندگی کے حامل ہو جاتے ہیں۔

مذہب کے یا خدا کے بغیر حیاتِ انسانی کا فکری دائرہ کتنا سمٹ جاتا ہے، بالکل

واضح ہے۔ تمام اقدار بے کارِ محض لگتی ہیں۔ اغراضِ ذات کا حصار ہر انسان کو اپنی گرفت میں لے کر انتہائی خود غرضانہ زندگی کا مقصد عطا کرتا ہے۔ تمام علوم وفنون کا ایک ہی مطمحِ نظر ہو گیا۔ زندگی کو طویل کرنا اور آسانی طلب کرنا۔ یہ مقصد اتنا آسان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک انسان کی آسانی اور طوالت زندگی کسی دوسرے کی کمی اور دشواری کا بھی سبب ہو سکتی ہے۔ باقی رہنے اور بہتر رہنے کا یہ جنون ایک ایسے سلسلۂ کشت وخون کا آغاز کر سکتا ہے جو مختلف جانوروں کی اقسام کی طرح نسلِ انسانی کو بھی معدوم کر سکتا ہے۔ زمانہ قدیم ایسے ہی انداز کا مالک لگتا ہے اور متعدد مرتبہ انسانی معاشرے کی تباہی اسی بات کی شہادت دیتی ہے۔ قدرتی آفات سے تباہ ہونے والے انسانی معاشرے تو ایک طرف رہے، متعدد معاشرے انسان کی باہمی زندہ رہنے کی خواہش میں بھی ملیامیٹ ہو گئے۔ آج بھی داستان مختلف نہیں۔ تمام اقدار انسان ایک بار ہی جینے کے جنون میں پامال ہوئیں۔ خدا کے بغیر یہ زندگی صرف فلسفہ قوت وطاقت کی اسیر نظر آتی ہے۔

طاقت جو ہر چیز کو معنی دیتی ہے، طاقت جو ہر چیز کا فیصلہ کرتی ہے، طاقت جو اقدار کی قائل نہیں بلکہ صرف دوسرے کی کمزوری کی قائل ہے۔ طاقت جو صرف زندہ اور غالب رہنے کی خواہش رکھتی ہے۔ طاقت اخلاقیات سے عاری ایک ایسا نظام ہے جس میں ذاتی یا اجتماعی احتساب کی کوئی گنجائش نہیں۔ طاقت لادین ہے اور لااخلاق۔ خدا کی تسلیم اس کا سب سے بڑا خوف ہے۔ زندگی کے بعد احتساب اس کی سب سے بڑی کمزوری۔ ظاہر ہے، کوئی متمرّد اور انا پرست فرد یا معاشرہ خدائی نظام کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیتا ہے۔ دوسری طرف کمزوری اور غلامی بھی تو مذہب تخلیق کر سکتی ہے۔ زندہ رہنے کی خواہش

بھی تو مذہب بن سکتی ہے۔ حقیقی اور مابعد الطبیعیاتی زندگی میں اللہ کا تصور یا تو حقیقت ہے یا رہِ فرار۔۔۔ ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آسکی کہ انسان خدا پرستوں کی زندگی ہی سے متاثر کیوں نظر آتا ہے اور جبر واستبداد کی روایات اس کی پسندیدہ کہانیاں کیوں نہ ٹھہریں۔ زندگی اگر ایک ہی بار جینا ہے تو ہمارا مکمل مطمحِ نظر شان وشوکت اور جبر واقتدار کی حامل وہ ہستیاں ہونا چاہئیں جنہوں نے ہر مکر وفریب اور ظلم وستم سے زندگی اور طاقت کے اصول کو اپنی منزل قرار دیا۔ پیغمبروں اور صلحا کی شریفانہ روایات اور خواب وخیال کی کہانیوں سے افس تو انسان کی میراث نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ یہ تضادِ فطرت انسان کے فکری تضاد کی نشاندہی کرتا ہے یا پھر درپردہ وہ ایک بار جینے کے فلسفہ کو قطعاً سچا نہیں سمجھتا یا پھر یہ کہ مسلسل گریز اور انکار کے باوجود وہ پیغمبرانہ صداقتوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔ خدا کا انکار مضحکہ خیز لگتا ہے۔ کون انسان ہے جو حیاتِ مختصر کے المیہ کو خدا کی دی ہوئی امید کے آخری سہارے سے بھی محروم کر دے۔ محض خدا کا خیال ہونا تو خدا کا ثبوت نہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا تصور تو موجود ہے مگر حقیقت میں ان کا کوئی سراغ نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی اور شے بھی جو محض تصور ہو، خدا کی طرح فعال اور متحرک ہے؟ کیا محض کوئی خیال زمان ومکاں کے تصور سے بچ سکتا ہے؟ کیا محض کوئی خیال اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ زندگی اور موت پر اس کا تصرف ہو؟ قوت وسلطنت پر اس کی حکومت ہو۔ حالات وواقعات اس کی توجہ کے محتاج ہو۔ مسکرانا، رونا، سوچنا سب اس کے ابروئے چشم کی جنبش کے محتاج ہوں۔ آخر اور بھی تو بہت سے دیوتا زمانوں میں گذرے ہیں۔ کوئی تہذیبِ قدیم بھی پتھر کے اصنام سے تہی نہیں، مگر زمان ومکاں میں بتانِ عہدِ قدیم کے اثرات محدود کیوں رہ گئے۔ یہ مکمل اور منظم خدائی کے گھرانے اپنے زمانے اور دورِ تہذیب سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے، مگر اللہ تو پہلے انسان سے لے کر دورِ

جدید کے فتنہ طراز ذہن تک کبھی بھی فکرِ انسان سے جدا نہیں ہوا۔ خدا اور اس کا مذہب تو اب بھی نسلِ انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے۔

خدا پر رائے زنی کرنے والوں نے صرف انسانی معاشرے کے عقائدِ الوہیت کو پیشِ نظر رکھا۔ انہوں نے کبھی بھی اس نقطہ نظر سے نہیں سوچا کہ خدا محض تصوری نہیں، حقیقت بھی ہو سکتا ہے۔ خدا کو محض ایک تصور کی حیثیت سے دیکھنا ایک ایسی حماقت تھی جس کے جملہ دانشور شکار رہے۔ ان عجیب و غریب مفکرین نے ایک ادنیٰ چانس کبھی اس آپشن کو نہیں دیا کہ خدا حقیقت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دانشور خدا کو مختلف معاشروں میں خودرو پودوں کی طرح کا خیال سمجھتے رہے۔ کسی نے اسے ضرورتِ انسان سمجھا اور کسی نے اسے ذہنِ انسان کے خوف و فکر کی علامت۔ حیرت ہے کہ علومِ عمرانیات کے ماہر اور فلسفہ الٰہیات کے دانشور، ہیئت اور ریاضی کے معزز اساتذہ، فلسفہ اور ادب کے مدعی خدا پر ایسی گفتگو کرتے رہے جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم کے Antique پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نہ ان کا مقصد خود شناسی تھا، نہ خدا شناسی، وہ تو بزعم خود انسان کے ذہنی امراض میں سے ایک پرانے اور پوشیدہ مرض کی توضیح فرما رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ ایک ایسا خیال ہے جسے انسانوں نے خود وجود بخشا ہے۔ اگر تحقیق اور جستجو کی جائے اور انسانی اعتقاد کی تہیں پھرولی جائیں تو ذہن کے کئی اجزائے منتشر ہمیں خدا کے تصور کو زندگی دیتے نظر آئیں گے۔ یہ ہولائی خاکہ کسی حقیقی وجود کے اردگرد نہیں بلکہ لفظوں کے چیستان کی مدد سے تخلیق کیا گیا۔ ایک ایسا مفروضہ جس کو کسی کی ذہنی اپج نے سانحاتی طور پر تخلیق کیا۔ یہ خیال (Idea) ہر زمانے میں مقبول اور موزوں رہا۔ اس فیشن ایبل پروڈکٹ کی ہر دور میں طلب رہی۔ لوگوں نے اسے مسائلِ حیات کے حل میں ایک مفید اور مددگار تصور پایا۔ ہر زمانے نے اسے اپنے الفاظ عطا کئے اور رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا طاقتور ہوگیا کہ کوئی اور جدید فیشن اس پر غالب نہ آسکا۔ اس کے انکار کی کوششیں بھی اس کا اقرار ختم نہ کرسکیں۔ مگر کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ پیاز کے چھلکوں کی طرح اگر کوئی الفاظ کے خول اتار کر دیکھے تو خدا محض ایک خلا اور ایک خیال رہ جائے گا۔ معاشرتی اور معاشی انصاف کے دانشوروں کو یہ خیال اس لیے بھی آیا کہ زمانہ کبھی بھی جزوی یا مکمل طور پر ان اقدار پر قائم نہ ہوسکا جو خدا کے کلام اور نظام میں درج تھے۔

اپنے محدود اوقاتِ زندگی میں ہمیں انصاف کتنا کم اور رحم وکرم کتنا مفقود نظر آتا ہے۔ کیا اللہ اگر حقیقی ہوتا تو انسان اس درجہ بے اعتدال زندگی گذار سکتا اور تاریخ کیا کشت و خون، قتل و غارت، جابرانہ تسلط اور بے رحمانہ واقعات کا تسلسل ہی درجِ صفحات کرتی۔ سوائے چند ایک مستثنیات کے تاریخ نظریہ خدا کو صرف ایک ردِ عمل اور فرار کا راستہ ہی قرار دیتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ کسی ظالم و سرکش کا ہاتھ اس وقت کیوں نہیں روکتا جب وہ ظلم وستم کی روایات قلم بند کر رہا ہوتا ہے؟ وہ کیوں محکوم اور مجبور کی مدد کے لیے براہِ راست مداخلت نہیں کرتا اور کیوں اپنے عظیم اور طاقت ور تصور کو شک وشبہ کے حوالے کر دیتا ہے؟ کیا اس کی بے پناہ قوت اور اَن گنت صفات زمین کے باسیوں میں کوئی ترتیب اور حسن وکرم کا تناسب نہیں تخلیق کر سکتی تھیں؟

مگر اس سوال کے حل کے لیے ہمیں خدا کے ضابطہ کار سے بھی کچھ آگہی چاہیے۔ اور یہ بغیر مطالعہ مذہب کے ممکن نہیں۔ مذہب کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا امتحان گاہ ہے‘ فیصلہ کرنے کی جگہ نہیں۔ انسان افعال واعمال سے آزمائے جا رہے ہیں اور مداخلت کی کوئی صورت بھی نظامِ عدل کو متاثر کرتی نہیں نظر آتی۔ فتح وشکست، علم ومعرفت، حسن وقبح، خیرو شر کوئی بھی امر زمین خود اختیاری ادارہ نہیں اور ان کا عرصہ کارکردگی بھی کسی فرد یا ادارے سے وابستہ نہیں۔ اگر فرد کا دائرہ کار اپنی ذاتی زندگی تک محدود ہے تو قوم کا ایک عرصہ دہر تک بھی طویل ہو سکتا ہے۔ افراد واقوام اپنے ذاتی اور اجتماعی طرزِ عمل سے بھی آزمائے جاتے ہیں اور حالات وواقعات کے بغیر یہ انصاف آزمائش ممکن نہیں۔ جملہ احتساب کا وقت زمین یا زندگی نہیں بلکہ موت کے بعد وہ عرصہ حیات ہے‘ جس کی طوالت بھی اعداد وشمار سے باہر ہے۔

مکمل جبر حالات کے بغیر آزمائش ممکن نہیں۔ امتحان میں انسان کو مدد تو مل سکتی ہے مگر طریق امتحان بدلنے کی قدرت نہیں عطا ہو سکتی۔ جملہ انسان اپنے مقرر کردہ طریق امتحان سے گذرتے ہوئے اپنے طرزِ عمل کا اظہار کرتے ہیں اور ہر کیفیت خیر وشر میں اپنے رویوں کو منضبط کرتے ہیں۔ یہ عرصہ حیات کسی بھی فیصلے کی ساعت تک نہیں پہنچتا۔ عروج وزوال کی صورت حال ظالم ومظلوم کا تعین نہیں کرتی بلکہ ظالم ومظلوم کی حیثیتیں بدلتی ہے۔

حاکم کو کبھی حاکم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور کبھی اسے محکوم کے انداز میں پرکھا جاتا ہے۔ خدائی نظام انتہائی معروضی ہے اور اس میں کبھی بھی جذباتی تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم اپنے وقتی اور داخلی تاثرات ریکارڈ کروا سکتے ہیں مگر نوعیتِ امتحان اور نتائج میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ البتہ اللہ نے پیغمبرانِ قدس کے ذریعے وہ اصول ضرور عطا فرمائے ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ کم سے کم تبدیلیوں کا مظہر ہوتا ہے۔ امتحان کے سوالات کی فہرست تو بہت طویل ہے مگر سب سے بڑا اور اہم سول یہ ہے کہ کیا انسان اللہ کو حقیقی تصور کرتا ہے یا مفروضہ۔۔۔؟ کیا وہ خالقِ حقیقی کو اپنی زندگی میں مداخلت کا کوئی حق دیتا ہے کہ اس کی تسلیم اسے غور، فکر اور عمل کی تثلیث میں کسی منزل اور مقصد کے تعین میں مدد دیتی ہے؟ کیا وہ عقل کے مناسب استعمال کی اہلیت کا حق ادا کرنے کے قابل ہوا؟ کیا وہ اشرف المخلوقات کے منصب کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ بقولِ قرآن، ”احسنِ تقویم کے پیمانے پر پورا اترا“؟ یہ وہ طرزِ فکر ہے جو خدا کی تسلیم کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ مذہب ہر انسانی قدر کا بانی ہے۔ مذہب ہی تمام اخلاقی اصولوں کا خالق ہے۔ مذہب ہی ہر معاشرے میں حرام وحلال کے تصورات کی بنیاد ہے۔ ایک عمومی جائزہ بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے

کہ ترقی یافتہ بزعم خود مہذب معاشرے انسانی اختیار اور آزادی کے نام پر اخلاقی قوانین سے انحراف کے رویے اپناتے رہے۔ چند افراد کی مادر پدر سوچ وائرس کی طرح جملہ کم علم اور کم فہم انسانوں میں غیر مذہبی، غیر اخلاقی اثرات تخلیق کرتی رہی۔ معیشت کی ترقی اس پر مہمیز کا کام کرتی رہی اور بہت سے صوفہ نشیں دانشوروں نے معاشی ترقی کو روحانی ترقی کے ساتھ منسلک کر کے نیا تصور معاشرہ تخلیق کیا۔

یہ نیا معاشرہ جدید اخلاقی رویوں کی تصدیق کرتا ہے۔ تمام اخلاق اور نفاستِ کردار کا مظہر صرف دولت ہی ٹھہرا۔ دولت اور طاقت کے اس امتزاج نے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا اور مذہب اور مذہبی اخلاقیات کو فرسودہ قرار دے کر خیر و شر، حرام و حلال، ظلم و انصاف کے نئے نظریات رائج کر لئے۔ بحر و بر میں فساد کی نئی صورتیں ابھرنے لگیں۔ کمرشل اخلاقیات کی زد میں خدا اور اس کا نظام کسی دقیانوسی کی اختراع نظر آنے لگا۔ فکر انسان کی منزل محدود ہوگئی۔ مشینی دور نے جہاں افسانوی ادب کی جہت بدل دی‘ وہاں روحانیت کی صورت بھی مسخ کر دی۔ روح ایک اضافی بوجھ کی طرح انسانی جسم پر مسلط ہو گئی۔ آسیب زدہ سوچوں نے اطمینان اور تشکر کا دامن سمیٹ دیا۔ بے خوابی، اعصاب شکنی، مستقبل کی غیر یقینی صورت اتنی بڑھ گئی کہ زندگی پر المناک موت کے سایوں نے غلبہ پا لیا۔ سب مانتے ہوئے انجان ہیں۔ مانتے ہوئے بھی بے یقین۔۔۔ ارتداد کے دلائل ناکافی ہیں مگر تسلیمِ پروردگار پر دل مائل نہیں۔ مساجد خوبصورت اور مندر شاندار مگر عبادت گذار بے کیف، بے خواب اور بے دل۔ یا پھر چند جنونی جو مذہب کو جبر و تشدد کی روایات سے ملوث کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اہل مذہب بھی بے سرور اور بے مذہب بھی بے

حضور۔۔۔ بے چینی، بے یقینی اور بے بسی کے اس عظیم بحران میں دل ان دیکھے خدا کے حضور فریاد کناں ہیں۔ آفتاب یقین کی ایک شعاع کے لیے بے تاب ہے۔ خدا نہ ہوگا تو زندگی کتنی ویران ہو سکتی ہے۔ یہ تو ان سائنسدانوں سے پوچھئے جو ایٹم اور ہائیڈ روجن کے فیوز اٹھائے بیٹھے ہیں اور دورِ جدید کی عقل کا آخری باب یہ ہے کہ دفترِ زندگی لپیٹ لیا جائے اور زمین کو اسی طرح تنہا چھوڑ دیا جائے جیسے یہ چار ارب سال پہلے تھی۔

قوموں کے عروج و زوال، آزادی، غلامی، امارت و غربت ذہنی حقائق کا حصہ نہیں لگتی۔ پیغمبروں کی حکومت میں بھی غیر درجاتی معاشرہ قائم نہیں ہو سکا۔ زمین پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا کہ کلاس لیس (Classless) سوسائٹی قائم ہوسکی ہو۔ تمام اقوامِ عالم ایک ہی جیسی کشادہ معیشت اور آزادانہ حیثیت کی مالک رہی ہوں۔ آج بھی ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ کسی مفروضہ جنت کا تصور پالا جائے۔ مشرق و مغرب کا فرق بڑا نمایاں رہا۔ جہاں مغربی اقوام خوف ناک انقلابات کی زد میں رہیں۔ مشرق میں ہم کوئی عوامی انقلاب نہیں دیکھتے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس و چین جیسے عوامی احتجاج مشرق میں ناپید ہیں۔ مگر انقلاب فرانس پرولتاریوں سے شروع ہو کر بدترین شہنشاہیت پر ختم ہوا اور انقلاب روس Classless یکساں طبقاتی معاشرہ حاصل کئے بغیر اپنے ہی کفن میں دفن ہو گیا۔ یہی حال نوشیروان کے زمانے میں مزدکیوں کے ساتھ ہوا جو دنیا کی پہلی بڑی اشتراکی تحریک ہے جس نے شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔

یورپی معاشرہ میں مارکس اور لینن کی نظریاتی کامیابی کی دو وجوہ نظر آتی ہیں۔

روسی معاشرہ بقا کی آخری حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ روس کے قریباً تمام معروف ادیب تالسٹائی، شولوخوف، دوستوفسکی، بورس، پیستر ناک، شونتیین وغیرہ اس سرطان زدہ صورت حال کی خبر دے رہے تھے۔ شاید اسی لئے کوئی ادب حقیقت پسندی میں روسی ادب تک نہیں پہنچا۔ کارل مارکس کے انقلاب نے طویل عمر نہیں پائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک مثبت نظریاتی انقلاب نہیں تھا بلکہ منفی ردعمل تھا جو اس معاشرہ کے امراء، روٴسا اور حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف تھا۔ مارکس کی تاریخ ہر جگہ درست نہیں اترتی، نہ اس کے نظریات ہی یورپ سے باہر مستعمل ہیں۔ مشرق میں مسلمان معاشروں میں اس قسم کے انقلاب کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک کی بجائے دو سوشل سیکورٹی سسٹم موجود تھے جن کے ہوتے ہوئے لوگ باہمی اقدار، حسن معاملگی اور معاشرتی اخلاق سے کبھی تہی دامن نہ ہوئے۔ زکوٰۃ اور صدقات کے دو نظام معاشرے کے لیے ہمیشہ استحکام کا باعث بنے اور غریب، نادار لوگ بڑے منفی ردعمل سے بچ گئے۔

جہاں تک مساوی تقسیم اور برتاؤ کا تعلق تھا، مسلمان واحد ایسا معاشرہ تھا، جس میں سلاطین وقت نے کوئی نسلی یا ذاتی پسند و ناپسند کا معیار قائم نہیں کیا اور غلام بھی ایسا نصیب پا گئے کہ سلاطین ٹھہرے۔ ہندوستان کا خاندانِ غلاماں، مشرق وسطیٰ کے دیلمی اور سلجوق غلاموں نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اتنی طاقت اور عزت حاصل کر لی کہ بادشاہوں کے بادشاہ بن گئے۔

مذہب کو افیون قرار دینا درست بھی ہے اور غلط بھی۔ صرف عیسائی دنیا میں مذہبی علماء کا کردار دیکھا جائے تو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پندرہ اور دس پاؤنڈ کے عوض جنت

کے سرٹیفکیٹ بانٹنے والے پادری غریب وامیر کو ایک ہی طرح لوٹ رہے تھے۔ نوابیت (Serfdom) استبداد کی پجاری تھی۔ مذہب ایک ایسے مندر کی طرح تھا جس کے پروہت اپنی زندگی کے لیے اپنے پجاریوں کے مال واسباب وجاں پر نظر رکھتے تھے۔ ٹیکس کا یہ حال تھا کہ پیدل گذرنے والوں پر بھی آنے جانے کا ٹیکس تھا اور تندوروں میں روٹیاں لگانے پر بھی۔ قتل وغارت کا بازار گرم، انسان سستا اور سائے مہنگے تھے۔۔۔

جبر واستبداد کے اس ماحول میں لوگوں کے جذبات کو ہوا دینے والے نعرے اور بورژوائی طبقے کے خلاف نفرت غریب کی مستقل سوچ بن چکی تھی۔ مارکس نے انہی منفی جذبوں کو ہوا دی۔ انقلاب روس انقلاب فرانس کی طرح ایسی نفرتوں کے بیج بو گیا جو مدتوں یورپی راکھ میں سلگتی رہیں۔ انقلاب فرانس نوآبادیاتی نظام کی نئی سوچ کا بانی بنا اور انقلاب روس اپنی منفی جذباتیت کی وجہ سے ساری دنیا کے لیے خوف وہراس کا باعث بن گیا۔

اسلامی معاشرہ انحطاط کے باوجود لوگوں کو دو بنیادی اقدار فراہم کر رہا تھا۔ ایک تو انصاف کبھی اتنا خطرے میں نہیں پڑا کہ لوگ اس کے احساس سے بھی محروم ہو جاتے اور دوسرے لوگ کبھی بھی وجود کی مکمل خاتمیت کے خطرے سے دوچار نہ ہوئے۔ اسلامی معاشرے میں جنگ اقتدار تو ہمیشہ جاری رہی اور تخت وتاج کے لیے بہت کشت وخون ہوا، مگر عوام تک ان جنگوں کی اور کشت وخون کا کوئی ہولناک اثر نہ پہنچا۔ بعض اوقات تو دنوں اور مہینوں کے وقفوں سے حکومتیں بدلیں مگر طرز زندگی اور اخلاق اور معاشرت ویسی ہی رہی۔ امراء کی اخلاقی اقدار بھی اللہ کے احکام سے تجاوز نہ کر سکیں اور بدترین حکام بھی ملکی

استحکام کے لیے اسلامی نظام اور معاشی طریق کے پابند رہے۔ مذہب کے خلاف محاذ آرائی کمیونزم اور سوشلزم کو راس نہیں آئی۔ عیسائیت کی حد تک تو انہیں کچھ کامیابیاں نصیب ہوئیں مگر مسلمانوں نے اس نظریاتی تصادم میں اپنے مذہب اور اقدار کا دفاع کیا۔ اسلام میں عیسایت کا سا ابہام موجود نہیں تھا۔ ایک صاف ستھرا مذہب، ایک مکمل اور منضبط کتاب قانون ایک ایسا ضابطہ حیات جو سوشلزم، کمیونزم کے تمام اصولوں کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ نفسیاتی، روحانی اور اخروی زندگی کے نتائج بھی بخش رہا تھا۔ مارکسزم (Marxism)، لیلینزم (Leninism) محمد رسول اللہ (ﷺ) کی تعلیمات کا اثر نہ توڑ سکے اور جب انہوں نے خیال سے بڑھ کر عملی اقدام اٹھائے اور جبراً مسلمان معاشروں کو مطیع کرنا چاہا تو اسلام اور مسلمانوں نے اسے بدترین اور مکمل شکست سے آشنا کیا۔ اسلام پر تین نظام ہائے فکر نے حملہ کیا۔ فلسفہ قومیت، فلسفہ لادینیت اور مذہبی شدت پرستی۔ قومیت مسلمانوں میں دیرپا نہ رہی اور اس فلسفہ سے پیدا ہونے والے اثرات نے مسلمانوں کی تقسیم کے سوا کوئی قابل قدر کام سرانجام نہ دیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا ایک فوجی نابغہ ضرور تھا مگر محدود فکر اور منفی ردعمل کا مالک تھا۔ دشمنوں سے آزادی تو ایک شاندار کارنامہ تھا مگر زوال پذیر علماء کی وجہ سے اسلام کا مخالف ہوجانا کسی کوتاہ بین ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ عرب نیشنلزم بھی امراء اور فوجی حکمرانوں کی سازش تھی جنہوں نے ایک بہت بڑی اسلامی خلافت کے ٹوٹنے سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح برطانوی تسلط اور نوآبادیاتی جبر سے آزادی میں قومیت کے فلسفہ نے مسلمانوں کا ساتھ دیا' مگر جاہ پرست حکمران واپس نہ پلٹ سکے۔ اقتدار کے پیچ وخم میں الجھ کر انہوں نے عالم

اسلام میں حکومتی تفرقہ کا ایسا بیج بویا جو آج تک جاری ہے۔ مذہبی شدت پسند یورپ کے عملی (Pragmatist) اور معروضی طرز عمل سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام کی اعلیٰ ترین علمی روایات نظر انداز کر کے محض شریعتی قوانین کو انقلاب اسلام کی بنیاد بنانا چاہا۔ اس نصف اسلام نے بھی مسلمانوں کو فکری اور علمی بحران کا شکار کر دیا۔ مدت ہوئی کہ اسلام کے دامن میں عمامے اور جبہ و دستار والے مولوی تو پیدا ہوتے رہے مگر کوئی غزالیؒ، شاذلیؒ، شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ یا عبدالقادر جیلانیؒ نہ پیدا ہو سکا۔

انسانوں نے بڑا مشکل راستہ چنا۔ اللہ جو شے انہیں آسانی اور رحم و کرم سے عطا کرنا چاہتا تھا، وہ انہوں نے جبراً بزعمِ خود لینا چاہی۔ اللہ جو انہیں بغیر اسباب عطا کرنا چاہتا تھا، وہ انہوں نے اسباب پر بھروسہ کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جوں جوں سلسلۂ عقل وشعور دراز ہوا، بالغ تر ہوا، انسان نے آسانی سے انحراف کیا۔ تحریص اور ترغیب نفس کے قائل ہوئے اور احکامِ خدا سے گریز اختیار کیا۔ وہ اس بچے کی طرح تھا جس کی تازہ اور ابھرتی ہوئی صلاحیتِ فکر نے اسے مبالغہ آمیز اندازہ کار کر دگی دیا۔ عجلت اس کا شعار رہی اور عجلت تو حماقت اور غلطی سے مبرّا نہیں ہو سکتی، اس لیے جب ربّ کریم نے اسے امانتِ عقل و شعور سے نوازا تو فیصلہ بھی سنا دیا کہ یہ ظالم اور جاہل ہے۔ دوسروں کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے اوپر ایسا بوجھ لا دلیا، جس کے اٹھانے کی اسے ہمت نہ تھی۔ حق و انصاف میں کسی فرد کو کبھی شبہ نہیں ہوا۔ مگر کتنے لوگوں نے علم اور آگہی کا ساتھ دیا۔ اکثریت جہالت میں کھو گئی اور خالق و تخلیق کی پہچان گم ہو گئی۔ جوں جوں آلاتِ شعور میں ترقی ہوئی۔ آگہی اب خارجی خداؤں سے منتقل ہو کر داخلی غرور و وجاہت کی طرف پلٹ گئی۔ اور وہ انسان جو ڈھلتے ہوئے سایوں، برق و باراں کی چمک اور خشک پتوں کی آہٹوں اور کھیتوں میں سرسراتی ہوئی ہواؤں سے

خوف کھاتا تھا‘ اب حکمت و حکومت کا دعویدار ہوا‘ فطرت کی تسخیر کا دعویدار ہوا۔ اب آسیب نے شکل و صورت بدل لی۔ خوف و وحشت کی جگہ غرور و وجاہت نے لے لی۔ پہلے ایک کی بجائے متعدد خداؤں سے ڈرتا تھا۔ اب زعمِ خدائی سے سرشار ہوا۔ نرگسیت کے اس شہکار نے اپنے سوا کسی اور کو موجود ماننے سے انکار کر دیا۔ خدائی کے لیے باہم دست و گریباں ہوا۔

یہ بہت مشکل راستہ تھا۔ تسخیرِ کائنات کے سراب نے انسانی عقل کو آسیب کی طرح چاٹ لیا۔ جو چیز حقیقتِ مطلقہ کی طرف اشارہ کرنے والی تھی‘ اسے معبودیت کے فلسفہ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔ تکبراتِ فکر انکسارِ عامیہ پر غالب آ گئے۔ ظالم و جاہل نے ماضی کی اَن گنت غلطیوں کا مداوا کرنے کی بجائے مستقبل کو مخدوش کر دیا۔ کیا ان متضاد انتہاؤں کے درمیان کوئی صبر و تسلیم کا راستہ ہے؟ کوئی ایسا راستہ جو انسانوں کو حقائق کا معروضی جائزہ لینے پر آمادہ کرے‘ جو اُسے آنے والے مہیب خطرات کی پیش بندی کرنے پر مجبور کرے۔ اشہبِ زمانہ کی باگ دستِ انسان سے چھوٹ گئی۔ شدتیں توازن کو نگل گئی ہیں اور بندہ اپنے خالق کی بجائے اپنے انجام کو بے باگ و رکاب اسپِ برق رفتار پر سوار مہیب‘ ہولناک اور تاریک جہنم کو بڑھ رہا ہے۔

وہ کونسا ایسا کرشمہ تھا جو ماضی میں نہیں ہوا۔ رسولوں کے معجزات اور اولیاء کی کرامات بظاہر عجیب نظر آتی ہیں‘ مگر یہ تو ایک اصول کی وضاحت کرتی ہیں۔ اسباب کے بغیر خارقِ عادت اللہ کی اعانت کے ساتھ وہ تمام کام وقوع پذیر ہوئے جس کے لیے

شاید ارب ہا ارب ڈالر اور روبل کے کارخانے بھی کم ہیں۔ ابراہیمؑ پر آگ کا اپنی فطرت سے گریز کر جانا معجزہ سہی مگر اصول بھی تو ہوگا۔ اور تین ہزار سالہ محنت کے بعد اگر سائنس محنت شاقہ سے اشیاء کی ماہیت اور نوعیت کے اصول دریافت کر لے تو کیا عجب ہوگا۔ قوم موسیٰؑ پر بادلوں کے سائے، صحرا میں چھاؤں، عصائے موسیٰؑ سے بارہ چشموں کا ظہور، حضرت عیسیٰؑ کا کوڑھی، برص زدہ اور دیوانگی کا علاج، مردہ کو زندہ کرنا بظاہر اسباب کے بغیر ہی تھا۔ پیغمبر اپنے لیے تو نہیں ہوتا۔ وہ ہر بات میں اشارہ ءامکان دیتا ہے۔ کیا تختِ سبا کو لانے والے نے Fusion اور Defusion کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ کیا سلیمانؑ نے تسخیر ریاح اور تختِ سلیمانؑ نے فضائی سفر کے رخ متعین نہیں کیے۔ کیا علومِ خضرؑ نے حالات و واقعات کی دوسری حیثیت نہیں واضح کی۔ کیا غیر معمولی مخلوق جنات و شیاطین سے محل نہیں بنوائے گئے۔ اور یہ تو زمین کی تسخیرات ہیں۔ معراج کے خوبصورت واقعہ میں وسعت کائنات کو محدود اور مختصر نہیں کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر انگشت مبارک رسول ﷺ نے چاند کے دو ٹکڑے کر کے زمین کے باشندوں کو حکومتِ کائنات اور خلافت زمین و آسمان کی نوید نہیں سنائی۔ معجزات صرف انسان کو صدمۂ حیرت دینے کے لیے نہیں تھے۔ یہ نفسیات دانوں کی سائیکک یا سائیکو پیتھک وضاحتیں نہیں ہیں۔

بارہ لاکھ انسان موسیٰؑ کے معجزات کے گواہ ہیں اور ہجوم عیسیٰؑ کے دستِ مبارک سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں اور پانچ ہزار اصحابؓ انگشت رسول ﷺ سے چشمہ پھوٹتے دیکھتے ہیں۔ اگر شہادت پر حقیقت کا انحصار ہے، تو یہ معجزات مکمل بصری اور عقلی شہادتوں سے مزّین ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے، کیوں؟ کیا معجزات کا مقصد صرف انسان کو حیران کرنا تھا۔ حیران

و پریشان تو وہ فطرت کے ناقابل فہم نظاروں سے بھی ہو جاتا ہے۔ حیران و سراسیمہ تو وہ چونکاہٹ، آسیب، وسوسۂ خیال، ہاتھ کی دستک اور پائل کی جھنکار سے بھی ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے واقعات کی کیا ضرورت تھی؟

کیا بتایا نہیں گیا کہ اے حضرت انسان! اگر تو خدا کی متابعت کرے اور مرسلین کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن ہو تو تجھے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلین ڈالرز کامپلیکس کی بجائے اخلاص اور توجہ سے بندگی کا حق ادا کر تا کہ عقبہ بن نافعؓ کی طرح قیراوان کے جنگل تیرے لیے خالی ہو جائیں۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی طرح مدائن کی طغیانیاں تجھے راستہ دے دیں گی۔ موسیٰؑ اور علا الحضرمی کی طرف نیل کا دریا اور حضرموت کی جھیل سمٹ جائے۔ اللہ کی قدرتِ کاملہ تیری شریکِ حال ہوگی۔ اندھیروں اور آندھیوں میں مدینہ کے اصحاب کی طرح شمعیں روشن کر دی جائیں گی۔ اُسید بن حضیرؓ کی تلاوت پر ملائکہ آسمان سے جھک آئیں گے۔ برا ابن مالکؓ کی قسم ہر حال میں پوری کی جائے گی۔ علی مرتضیٰؓ کے ہاتھوں درِ خیبر پر کاہ کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ عمرؓ ایک ہزار میل دور سے نعیم بن ساریہؓ کو آواز دیں گے تو سنی جائے گی۔ خالد بن ولیدؓ زہر ہلاہل کی چٹکی پھانک لیں تو تاثیرِ زہر روک دی جائے گی۔ ابن عباسؓ کی فراست کو قیامت تک کے لیے جلا بخشی جائے گی۔ بخاریؒ کی دعا نکلتے ہی قبول کی جائے گی۔ محمد بن محمد الجزریؒ کی دعا سے دمشق سے لشکر پلٹا دیے جائیں گے۔ عبدالقادرؒ کو تسخیرِ جن و انس عطا کی جائے۔ شاذلیؒ کو حزب البحر کے مفادات پہنچیں گے۔ علی بن عثمان ہجویریؒ کو حجاب زمین اٹھا کر کعبہ کی جہت دکھائی جائے گی۔

کچھ کام تو سائنس نے کر لیے مگر بے برکت محنت اور بے حقیقت سوچ نے انسانی محنت کے انجام کو مشکوک کر دیا۔ تعمیر، تخریب کی آلہ کار بن گئی۔ بقا کی کوششیں مکمل تباہی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ فائدہ مختصر اور نقصان بے انداز۔ خدا کے بغیر ظالم و جاہل نے اپنی کائنات کو خطرات و وساوس کا پیرہن پہنا دیا۔ آج کوئی ایسا نہیں ہے جو خود فراموشی کا شکار نہ ہو۔ معجزات اور کرامات کے حامل بے اطمینان اور بے بصر تو نہ تھے۔ ان کی زندگیاں انتشار اور اعصاب زدگی کا شکار نہ تھیں۔ ظاہر و باطن میں جو اطمینان ان لوگوں میں نظر آتا ہے، آج کی زندگی کا ناقابل حصول خواب ہے۔ اللہ نے انسان کو آسانی بخشنا چاہی۔ ویسے بھی مسافر پر کرم کیا جاتا ہے۔ زمین کے مستقر پر چند لمحے آرام کرنے والے اس قافلۂ حیات کو کہا گیا تھا کہ یہ تمہارے لیے آسانی اور فائدہ کا باعث بنے گی۔ ”مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ“، مگر تم نے وعدۂ پروردگار پر اعتبار نہ کیا۔ آسانی کو دشواری میں بدل دیا۔ بقا کو فنا سے ہمکنار کر دیا۔ زندگی کو بندگی سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اور خدائے واحد اور کریم کے دنیاوی اسباب کی ایک آنکھ روشن کی۔ علم و معرفت کی آنکھ اندھی ہو گئی۔ اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل خدا کی بجائے دجال کے سپرد کر دیا...... ”انسان نے بڑا مشکل راستہ چن لیا“۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ کے لیے کوئی اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں۔ کسی حساب و کتاب کی رو سے کسی تصور کو حقیقت میں نہیں بدلا جا سکتا۔ مدتوں سے خدائی ایک ردائے آسیب کی طرح انسانوں کے حواس پر محیط ہے۔ کچھ جرأت مندوں نے انکار کی ہمت کی، مگر دورانِ زماں نے انہیں بادلوں کی بگڑتی ہوئے اشکال کی طرح مٹا دیا۔ حقیقت پرستی عجیب ہوتی ہے۔ نظری اور عملی شہادتوں پر بنیاد ایسا رویہ ہے جو صرف وقتی سچائی کا حامل ہوتا ہے۔ بہت سے سائنسی حقائق کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ داخلی اور نظریاتی تصور اس تیزی سے تبدیل نہیں ہوتے جتنی سرعت سے سائنسی حقائق بدلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ سائنس تمام تر خود شناخت تصورات ہیں جنہیں انسان زور و محنت سے حقائق میں بدل دیتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو تمام سائنسی سہولتیں انسانوں کے وہ خواب ہیں جو شائد انہوں نے نیم وا آنکھوں سے سلگتے ہوئے الاؤ کے گرد صحراؤں اور بیابانوں کی تنہائیوں میں دیکھے ہوں گے۔ خواب جو شاید سائنس نے پورے نہیں کیے بلکہ کسی غیر مرئی طاقت نے ان کی عاجزی اور انکساری کے ان اوقات میں حادثاتی طور پر یا زمانوں کی بدلتی ہوئی اشکال کے ساتھ انہیں عطا کر دیے۔ شاید اسی لیے ایک صدی دوسری صدی سے ایک عرصۂ زمانہ دوسرے

سے مختلف ہوتا ہے۔

زمانوں کی جدائی کے انداز ہی فلسفہ اور سائنس کی تفریق کا باعث بن گئے۔ ہم نے ایسا چاہا اور سوچا یا ہم سے ایسا سوچوایا گیا۔ ہمیں ہر صدی میں زندگی کے آداب سکھائے گئے اور طرزِ حیات کی تبدیلیوں سے آشنا کیا گیا۔ انسان نے غور و فکر کو ہمیشہ ذاتی متاع سمجھا۔ صدیوں سے اس نے کسی ایسے امکان کو نظر انداز کیا جس کے تحت شاید اس پر سائنس اور تصورات کی دوسری صورتیں القا کی گئی ہوں۔

صلاحیتِ فکر میں خودستائشی تو بہت ہے۔ یہ نشۂ افتخار تو حرزِ جاں ہوا ہے۔ اس کے لاحقے بے شمار ہیں۔ یہ لذتِ وجود بھی ہے، نزہتِ خیال بھی، یہ زمانے کی تفریق بھی اور انسانوں کے مابین علیحدگی کا باعث بھی۔ اچھے اذہان نے غور و فکر اور صلاحیتِ نظر کو کبھی بھی عطیۂ پروردگار نہیں سمجھا۔ البتہ اپنی متاع قرار دیا، جس کے لیے وہ کسی کا شکر گذار نہیں ہونا چاہتا۔ ذہن کی بدترین حسِ کمتری یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منت پذیرِ غیر سمجھے۔ اللہ ہی تو غیر تھا۔ وہ پھر اسے کیوں مانتا؟ ڈلفی کا پانی تھان خدا کی خبر کیوں دے گا۔ وہ تو اپنی دیوتائی کا معترف ہے۔ تصور اور محنت کی یکجائی نے ذہانت کو خودستائشی کا ایسا نظریہ دیا کہ وہ اس میں کسی خارجی عطا و بخشش کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اللہ کا تصور تو زمانوں میں انسانی تہذیب و تمدن کے لیے ہمیشہ تعمیری، تخلیقی اور امن افزا رہا۔ یہی تو ایک تصور ہے جو کبھی بھی انسانی نقائص اور جہالتوں کے ہم معنی نہیں ہوا۔ تہذیبِ انسان کی شدتیں اور حماقتیں اسی تصور سے متوازن ہوتی ہیں۔ ظلم و بربریت کے خلاف احتجاج یہی خیال کرتا رہا۔ انصاف اسی نام

سے پائدار رہا۔ فکر و عمل میں شائستگی خدا کے نام ہی سے رہی۔ باوجود بدترین ملحدانہ اور مشرکانہ اعتقاد کے انسان معاشرے سے خدا کے تصور کو ناپاک کرنے کے قابل نہیں ہو سکے۔ جو فلسفہ اخلاق اور قوانینِ اخلاق اس وقت زمین پر موجود ہیں' سب اللہ اور اس کے مذاہب کے توسط سے پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔

مذہبی سماج ضرور برائیوں میں ملوث ہوئے اور مذہب کی بنیاد پر لوگوں نے مال و زر اور جاہ پرستی کو بھی رواج دیا مگر ان تمام مواقع پر خدا ابھی مذہب سے جدا ہوتا لگتا ہے۔ اللہ کے تصور میں جہالت، ناانصافی، رشوت ستانی، امرو پرستی اور اخلاقی اضمحلال کی آمیزش کبھی نہیں ہوسکتی۔ آج کے اس دورِ پُرآشوب میں، قحطِ اخلاقیات میں، مکمل انتشارِ افکار میں، زبردستوں کے تمرد اور تجاہل میں، اللہ کا خیال ہی واحد پناہِ مظلوم و مجبور رہے۔

اللہ کے اعداد و شمار یوں تو بیشمار تھے مگر حقائق پرستوں نے اسے جاننے سے انکار کر دیا۔ علت و معلول کے تسلسل میں' خلق اور خالق کے تصور میں، انکار و اقرار کے بحران میں، اللہ کے علاوہ بھی کوئی جواب عقلِ انسان میں نہیں پڑا۔ کائنات کا وجود، گلیکسی کے پھیلاؤ، زمان و مکاں کی وسعتیں، اَن گنت سیارگاں کے امکانات، وہم و گماں سے وسیع تر فاصلے، زمین کی اور اس کے رہنے والوں کی بے چارگی اس مہیب پھیلاؤ میں زمین ایک ذرے کی طرح لگتی ہے' جسے لاکھوں درجہ بڑھا کر کوئی دوربین سے دیکھ رہا ہو۔ انسان کا یہ قد و قامت مصنوعی لگتا ہے۔ یہ زمین مصنوعی لگتی ہے۔ یہ اندازِ زندگی محض افسانہ لگتا ہے۔ اس وسعتِ زمانہ میں انسانی زندگی شبۂ خیال، ایک استعارہ فرضیہ اور تجاہلِ تعرف لگتا ہے۔ مگر

مجھے ہی زندہ رہنا ہے اور مجھے ہی مرنا ہے۔ اور پھر میرے افسانہ حیات میں کوئی دوسرا ورق نہیں ہے تو میں کیوں معاشرہ، ملک وملت، عزت وتوہین، قائمیت اور دوام کے تصور پالوں گا۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ خدا اور آخرت کے تصور کے بغیر کوئی مجھے بتائے کہ میری اس عزت اور شہرت کو جو میرے بعد مجھے نصیب ہوگی' وہ کس طرح مجھ تک پہنچ سکے گی۔ میں ایسی محنت کیوں کروں گا جو انتہائی غیر حقیقی اور احمقانہ انجام تک پہنچنے والی ہے۔ جس کا انعام مرنے کے بعد خلق کی ستائش ہے۔ کیا انسان اس سے بھی زیادہ احمقانہ خواہش پال سکتا ہے؟

انسانی فکر کا المیہ یہ ہے کہ تمام استفسار انجام کار لاینحل ہے۔ آپ اللہ کو ماننے کی زحمت نہ فرمائیں مگر ابھی تک وہ تمام جوابات جو انسانی فکر نے زندگی اور کائنات کے بارے میں دینے کی کوشش کی ہے' محض تضیع اوقات اور ڈرائنگ روم کی گفتگو لگتے ہیں۔ خدا نہیں تو فطرت خالق ہے۔ فطرت جو کائنات تخلیق کر رہی ہے۔ فطرت جو لگے بندھے قوانین کے تحت اپنا کام بغیر کسی جذبہ وخیال کے سرانجام دے رہی ہے۔ فطرت جو کشش ثقل کے قوانین میں ہے۔ فطرت جو اضافت کی خالق ہے۔ فطرت جو کوانٹم کے قوانین مرتب کر رہی ہے۔ فطرت جو جینیاتی طریقہ کار کی خالق ہے۔ فطرت جو انتہائی پیچیدہ مائکرو کازم میں مصروف کار ہے۔ فطرت جو میکرو کائنات میں نت نئے مراحل طے کر رہی ہے۔ فطرت جو زندگی وموت میں کارفرما ہے۔ فطرت جو حسن وبدصورتی کی کرشمہ ساز ہے۔ فطرت جو جذبہ وخیال کا تنوع ہے۔ فطرت جو رنگ وبو، گل ولالہ، قمری وبلبل میں نغمہ سرا ہے۔ فطرت جو مکمل شعور ہے' مکمل فعال ہے۔ فطرت تخلیق کار ہے۔ فطرت کارساز ہے۔

فطرت موت ہے۔ ہلاکت ہے، مکمل تباہ کار ہے۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ فطرت کے پاس ذہانت ہے، زبان ہے، جدید ترین آلاتِ تخلیق ہیں مگر بیچاری گونگی ہے۔ فطرت کے پرستاروں کی بات ناقابلِ فہم ہے۔ فطرت کے پاس کوئی مرکزیت نہیں۔ فطرت کی کوئی شخصیت نہیں۔ فطرت کوئی وجود نہیں ہے۔ فطرت بے زبان ہے۔ فطرت بے چاری یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ میں فطرت ہوں۔ میں ہی پروردگار ہوں جو کچھ بھی تم ہو میں ہوں۔ میں اجتماعِ ضدین ہوں۔ میں تخلیق وتخریب کے جملہ اسباب وقوانین ہوں مگر افسوس کہ میں جو تمہیں زبان بخشتی ہوں، حرف و کتاب بخشتی ہوں، ذہانت و خطابت عطا کرتی ہوں، وضاحت و بلاغت کے انبار لگا سکتی ہوں۔ میں خود بے زبان ہوں۔ کسی بھی پیرایۂ اظہار سے عاجز ہوں۔ افسوس کہ اپنی تخلیقات سے زیادہ مجبور و عاجز ہوں۔ میں کم از کم خدا نہیں ہوں۔ دیکھئے تمام اعداد وشمار یہاں آ کے ختم ہو جاتے ہیں۔

جانور اور انسان میں شاید آرزو کرنے کا فرق ہے۔ جبلت کا اشتعال وقتی ہے۔ بھوک ضرورت ہے۔ بچے سے انس جبلی ہے۔ حفاظت جبلت ہے۔ کیا جانور بھی خالی نگاہوں سے فضائیں گھورتے ہوئے کسی دوسری کائنات کی آرزو کر رہے ہوتے ہیں۔ کیا وہ بھی تصور میں کوئی سکائی سکریپر کا نقشہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ شاید نہیں۔۔۔ شاید ایک اور فرق بھی انسان اور جانور میں ہو۔ جیسے ذہنِ انسانی میں جبلت ایک مداخلت کار کی طرح آتی ہے۔ جانور میں ذہانت بھی کبھی مہمان ہوتی ہے۔ مگر جانور کے اس لمحے کا انسان کو بہت کم علم ہوتا ہے۔ اگر ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ جانور اس وقت ضرور فکرِ انسان کے ماتم میں ہوتا۔ ہمارے پاس اعداد وشمار نہیں محض تصور تو حقیقت نہیں ہو سکتا۔ شاید تصور کو حقیقت بننے

میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ آخر اڑن کھٹولے سے لے کے چاند پر اترنے کی حقیقت تک کچھ صدیاں تو گذر ہی گئیں مگر آرزو کہاں ہے۔ کیا ہم میں خدا کو جاننے اور ماننے کی کوئی آرزو سلامت ہے؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ صدیوں کے اس تصور کو بھی مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھ سکیں؟ عجیب بات دیکھئے کہ خدا کا تصور دورِ حاضر میں کھو گیا مگر بے شمار لوگ جن و پری، تعویذ، جادو، آسیب کے تصورات کے شکار ہیں۔ کیا اس بظاہر ناقص متبادل تصور سے ظاہر نہیں ہے کہ آرزو قائم تو ہے مگر مسخ ہو گئی ہے۔

کیا سائنس آسیب نہیں بن گئی۔ تعمیر و تخریب کے اعداد و شمار میں بہت فرق ہے۔ سہولتیں محدود اور آلاتِ کشت و خون لامحدود۔۔۔ یہ کون ہے جو مسلسل ہمیں بتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ خدا کے لیے کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔ وہ تمام دلائل جو فلسفہ و ادب نے خدا کے لیے تخلیق کیے تھے' سائنسی اعداد و شمار نے بلڈوز کر دیئے۔ اب بے چارہ خدا پرست اندھا دھند تقلید پر مجبور ہے۔ یہ اندھا دھند تقلید ایک گلہ ہے، شکوہ ہے۔ سائنس کی چیرہ دستی سے ایسے لگتا ہے کہ مجبور اور عقلی معذور خدا پرست سائنس کے گلہ گذار بھی ہیں اور معذرت خواہ بھی۔ وہ کہنے لگتے ہیں کہ اے اہلِ سائنس! تم سچے ہو۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ مگر ہم اپنے اعتقاد کو ترک کرنے سے قاصر ہیں۔ تم نے ہمیں خدا تو نہیں دیا مگر ہمارے خدا کے یقین کو ضرور متزلزل کر دیا ہے۔ اندھے اعتبار کی یہ کیفیت قابلِ رحم بھی اور مضحکہ خیز بھی۔ اس اعتقاد کو قائم رکھنے کی خاطر تشدد روایت بن چکا ہے۔ دینی معاشروں کا ردِ عمل اور لا دینی معاشروں کا استبداد ایک دوسرے سے باہم دگر برسرِ پیکار ہیں۔

بدقسمتی سے خدا کی تقسیم مذاہب ہی سے شروع ہوئی۔ مذہب کو جس رواداری او

روسعتِ کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا‘ نہ ہوا۔ ہر گروہ نے مذہب کو ذاتی اور قومی ملکیت تصور کیا اور کسی دوسری قوم کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اسی خدا کی پرستش کرے۔ بلکہ مذاہب کی تفریق خدا کی لامحدود قدرت کو محدود کرتے ہوئے دوسرے خداؤں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ سوائے اسلام کے کوئی مذہب بھی تصورِ الہیات کے تسلسل کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام واحد مذہب تھا جس نے اللہ کے دین کی تکمیل کا دعویٰ کیا مگر باقی مذاہب کے پیغمبروں اور شریعتوں کا مکمل احترام ملحوظ خاطر رکھا۔ اسلام کو صرف اعدادوشمار پر اعتراض تھا۔ اسلام بلکہ اللہ اس بات سے آگاہ تھا کہ جملہ ہدایات جو اس قرآن سے پہلے نازل کی ہیں صنعتِ اعتبار میں کمزور ہیں۔ ایک تو وہ آیات، ہدایات اسی وقت منضبط نہیں ہوئیں‘ پھر تواتر کے ساتھ انہیں دہرایا نہیں گیا اور زمانی فاصلوں سے انہیں جمع کیا گیا۔ اشرافیہ اور امراء نے مختلف مواقع پر اس Text کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے لفظی اور کلماتی تحریف کی۔ اس کے باوجود قرآن نے ان کو اللہ کی کتابیں کہا اور پیغمبرانِ قدیم کو اپنے محبوب ترین بندے قرار دیا۔ مگر قرآن میں ان کتابوں کی مسلسل تحریف کا گلہ کیا گیا‘ مگر کیوں؟

سائنسی حقائق کے مقابلے میں فرضی تحریرات یا خودساختہ خیالات کی کیا توقیر ہو سکتی ہے۔ اس علیم و خبیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آئندہ زمانہ میں انسان کیا سوچے گا اور کیا کرے گا۔ آخر افعال و اعمال اور حالات و واقعات تو اس نے ترتیب دے رکھے تھے۔ آفرینشِ کائنات سے انجامِ کائنات تک ماسٹر پلان (لوحِ محفوظ) جدید انسان کے ذکر سے خالی نہ تھی۔ اس کی ایجادات، اختراعات، فلسفۂ حیات، اندازِ معاشرت و معیشت لوحِ محفوظ کے اوراق کی کشاد تھی۔

وہ جانتا تھا کہ فکر و ذہانت کی خود ستائشی آخر انسان کو انفرادی اور اجتماعی آزادیوں کے خواب دکھا کر کائناتی قواعد سے انحراف کرنے پر مجبور کرے گی۔ اس تمام انحراف کی بنیاد بظاہر حقائق کے اعداد و شمار پر ہے۔ اور تمام اعداد و شمار کی آخری تحقیق یہ ہے کہ اللہ کے لیے کوئی اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں۔ اس تصور کو حقائق اور منطق کے اصولوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ منطقی اثباتیت کے دانشور اور اشتراکی ردعمل کے حامل اور تشکیک کے فلسفہ کے پیروکار محنت سے گریزاں رہے۔ انہوں نے خدا کے سوال کو عوام کا خودساختہ اعتبار سمجھ کر حل کرنا چاہا۔ انہوں نے کبھی بھی اس سوال کو اس معروضی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جس سے وہ دوسرے حقائقِ زندگی کو جانچتے اور پرکھتے تھے۔

سائنس نے کبھی اتنی بڑی حماقت کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا سائنسدانوں نے تصور خدا میں کیا۔ جنہوں نے اس کو محض تصور سمجھا وہ بھی، جنہوں نے اس سے گریز کیا وہ بھی اور جنہوں نے اس کی مخالفت میں زبانِ طعن دراز کی وہ بھی۔ بھلا حقائق پرست اس حقیقت سے کیسے گریز کر سکتے تھے کہ اگر خدا موجود اور فعال اور قوتِ مطلق ہے تو وہ اس سے کس طرح معاملاتِ زندگی میں نجات پا سکتے ہیں۔ رہی اعداد و شمار کی بات تو کسی نے بھی خدا کی طرف سے پہنچی ہوئی دلیل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ نہ اسے پرکھا، نہ اس کے اثبات کا جائزہ لیا۔

اعداد و شمار تو موجود تھے مگر دو چار لفظ میں نہیں، مفروضہ داستانوں میں نہیں، نہ کسی افسانوی ادب ہی کی صورت میں، بلکہ ایک عظیم مسودہ اور مکمل محفوظ کتاب کی شکل میں جس کا

ہر لفظ لفظِ خدا، ہر نقطہ، ہر جملہ، ہر خیال خیالِ خدا تھا، جس کی تمام اطلاعات الہام تھیں، جس کا انداز خطاب اور پیرایۂ اظہار انفرادی اور خدائی تھا۔ اسی خدا نے اپنے تمام قدیم مخطوطات کو غیر صحت مند قرار دیا تھا۔ اسی نے ان کو سندِ اعتبار سے کم تر قرار دیا تھا۔ کیا حماقت ہے کہ اللہ جن اعداد و شمار کو خود ترک کر رہا ہے، دانشور اُن کو دلیل بنا کر خدا کے تصور پر اعتراض کر رہے ہیں۔ کیا تعصب ہے کہ خدا جس کتاب کو پیش کر رہا ہے، اس سے یہ عصرِ حاضر کے دانشور مسلسل گریز کر رہے ہیں اور جن سے اس نے سند اٹھالی، ان کو بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ عقل و معرفت کے اس المیہ کے لیے ہمارے پاس کیا دلیل تھی جس کا شکار لارڈ رسل بھی، آرجی اور مارکس بھی ہوا۔ عصرِ حاضر کے یہ تمام عقلی اور علمی بددیانتی کا شکار ہوئے اور محسوس ہوتا ہے کہ زمانے کی خواہش نے انہیں علمی تساہل اور دروغ گوئی پر مجبور کیا یا یہ کہ وہ اس سوال کو کم اہمیت کا حامل سمجھتے رہے جو شاید پہلے سے بھی ناقص تر اپروچ تھی۔

فلسفہ اور سائنس کے یہ مدعی یا تو حقیقت جاننے کے خوف سے لرزاں تھے یا وہ اپنی صلاحیتیں تمام تر دنیاوی وجاہتوں کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ قرآن نہ تو تصور تھا نہ مفروضہ۔ قرآن انسانوں کے اذہان میں محفوظ لاکھوں کتابوں کے اوراق میں درج ان گنت انسانوں کی زندگی میں حق و ناحق کا فیصلہ کار، دنیا کی تمام کتاب گھروں میں موجود کوئی ایسا ڈیٹا تو نہیں تھا کہ جسے تلاش نہ کیا جا سکے یا جس سے روگردانی کی جا سکے یا زندگی کے اہم ترین فیصلے میں اس کی حیثیت کو نظر انداز کیا جا سکے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ فیصلہ قرآن کے حق میں نہیں

کرتا تھا بلکہ اس ہستی کے موجود و نا موجود کے بارے میں جس کے بغیر زندگی کا ایک قدم بھی گمراہی اور صداقت میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ فیصلہ کے لیے قرآن آپ کی منت نہیں کر رہا۔ اللہ نہیں کر رہا بلکہ ہر انسان کو ایک موقع فراہم کیا جا رہا ہے' اس کی عقل و معرفت کو ایک اشارہ مہیا کیا جا رہا ہے۔ تشکیکِ ذہن کو جواب دیا جا رہا ہے۔ زبانِ طعن تمیچی جا رہی ہے۔ غرور و وجاہت کو انکساری کا سبق دیا جا رہا ہے۔ جہنم اور جنت کی تفریق واضح کی جا رہی ہے۔ بے پناہ صدیوں کی اذیتوں سے رہائی کا اذن دیا جا رہا ہے اور انکار کے خوفناک نتائج بتائے جا رہے ہیں۔ جملہ الہامی کتابوں کا موضوع ایک ہے اور اس ایک موضوع سے کسی اہلِ کتاب نے انحراف نہیں کیا۔ یہ موضوع اللہ ہے، خدائے مطلق کی آگہی ہے، ملکیت اور مملکت کے نظریات کی وضاحت زندگی اور موت کی جواب دہی ہے، آدمؑ سے محمد ﷺ تک شریعتیں بدلتی رہیں۔

ذہنِ انسان کی ترقی اس طرح جیسے آج بچے کی ذہانت کی ابتدا اور بلوغتِ فکر کا درجہ کبھی تمام انسان بچپن کے معیارِ عقل پر قائم تھے۔ عقل ابھی آلاتِ ترقی سے آشنا تھی۔ معلومات مختصر اور علم محدود تھا۔ شریعت بھی محدود تھی۔ قرآن سے پہلے بھی قرآن تھا۔ اسی کتابِ محفوظ کے چند اوراق پرانی شریعتوں کا شرفِ ہدایت تھے۔ انسان میں غور و فکر کی مکمل استعداد نہ تھی۔ ان کو اتنی ہی تلقین کی گئی جتنی ان میں سموئی جا سکتی تھی۔ علم و حقائق کی بنیاد صرف ایک ہے اور بہت ہی ضروری ایک بات کہ انسان زمین پر آزاد نہیں ہے۔ وہ زمین پر خودرو بیل کی طرح نہیں اُگا اور بے محابا پھیلاؤ کا شکار نہیں ہے۔ ہر شے گنی چنی ہے۔ زمین اور آبادی ایک تناسب ہے۔ ذرائع زندگی اور افراد متعین ہیں۔ اعمال اور مقاماتِ جبریت

سے ملحق ہیں۔ کیفیات متبدل اور متغیر ہیں مگر اسباب متعین ہیں۔ یہ اہم ترین فیصلہ زندگی ہے۔ شریعت اور پیغمبر اس سبق کو کم وبیش دہراتے چلے آئے ہیں۔ خبردار کرتے چلے آئے ہیں۔ لانیت فکر سے پرہیز بتاتے چلے آئے ہیں۔ امراضِ قلب وفکر کی نشاندہی کرتے چلے آئے ہیں، مگر جبراً نہیں۔ فیصلہ یہی تھا کہ راستوں کی نشاندہی تو ہو، مگر کسی کو کسی راستے پر دھکیلا نہ جائے۔ خیر وشر کی تلقین کی جائے، مگر وہ زبردستی مسلط نہ کیے جائیں۔ عقل کی واحد خوبی چناؤ ہے اور ہر چیز کے تعین میں اس چناؤ کو آزاد کر دیا گیا۔ چاہتوں کے رستے کشادہ ہیں۔ چننے کی صلاحیت موجود۔ رحمت سے مراد تلقین وہدایت اور واقعات وحادثات میں انسانوں کی مدد مگر بس۔۔۔

شریعتوں کی تبدیلی سے مراد نیا مذہب نہ تھا بلکہ بدلتے ہوئے زمانوں اور قدار کے ساتھ نسلِ آدم کو مناسب تربیت اور موقع فراہم کرنا تھا، مشقت سے بچانا تھا اور تسلیم کی منازل کے سنگ ہائے میل روشن کرنا تھے۔ تمام مذاہب کا بنیادی مقصد صرف ایک ہی تھا اور خدا کی پہچان، اس کی حاکمیت کا اعتراف اور اس روگردانی کے عواقب سے آگہی تھی۔ مقصدِ حیات، فکر ونظر، جستجو اور تحقیق، رشد وہدایت، تعلیم وتربیت کے تمام مقاصد کو قرآن ایک ہی جملے میں سمیٹتا ہے۔ انّ ھدینا السّبیل امّا شاکراً وّ امّا کفورا۔

تمام عقل ومعرفت اس لیے عطا کی گئی کہ چاہو تو مانو، چاہو تو انکار کر دو۔ بھلا مذہب کب کا بھکاری ہوا کہ آپ سے توجہ کی بھیک مانگے۔ اللہ کو آپ کی اتنی ضرورت نہیں۔ آپ کو ضرور ہے۔ اس کی زندگی کا انحصار انسان پر نہیں۔ وہ اُس ساحرۂ عہدِ قدیم کی

طرح نہیں کہ جو اپنے عبادت گذاروں کی تعریف وتوصیف پر زندہ ہے۔ انسان کو اپنے بارے میں بہت غلط فہمیاں ہیں مگر اللہ کے بارے میں اس سے بھی زیادہ۔ کچھ اسے تصوراتی آمرِ مطلق کی طرح دیکھتے ہیں جو کائنات ظلم وجبر کو انائے مطلق کی بے رحم قوت سے چلا رہا ہے اور کچھ اس کو ایسا مجبور سمجھتے ہیں کہ اس کی تسلیم اس پر احسان کی طرح کرتے ہیں اور اس کی تعریف اپنی صلاحیتِ فکر کے مترادف سمجھتے ہیں۔

مذہب کے مقصدِ اعلیٰ کو جانے بغیر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ جاننا ضرور ہے کہ زندگی کسی قاعدے اور قرینے کی پابند نہیں۔ اور ہم کہاں تک آزاد ہیں۔ خدا کے بغیر زندگی کا تصور شاید وہی ہو جو آج کے مغربی انسان کو ہے۔ مگر خدا کے ساتھ یہ تصور محض بے راہ رویٔ فکر وعمل ہے۔ حیرت ہے کہ اتنے بڑے فیصلے کے بغیر ہم زمین پر زندگی کیسے گذار رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم اپنے آپ کو اتنے بڑے جرمِ آگہی کے باوجود معقول اور محفوظ سمجھتے ہیں۔ بات تو اعداد وشمار کی تھی۔ حقیقت پسندی کی تھی۔ کیا اس دعویٰ کی پرکھ معقول ہے جسے صاحبِ دعویٰ خود تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ جب اللہ اپنی سابقہ کتابوں کو بطور دعویٰ پیش نہ کر رہا ہو تو کوئی صاحبِ عقل وشعور ان پر انکار کی بنیاد رکھے گا۔ جب اللہ خود ایک دستاویز کو اپنی قرار دے رہا ہو اور اس پر اس کے دعویٔ حق کی بنیاد ہو تو اس کے بغیر کیا کسی حقیقت کی تصدیق ہو سکے گی۔

وجود کی بحث ناممکنات میں سے ہے۔ اتنے مختصر سے عرصۂ زندگی میں اتنی مختصر سی معلومات کے ساتھ اور اتنے کم ذاتی، کائناتی اور آفاقی تجربات کے ساتھ ہم اتنے عظیم

المرتبہ وجود کی کیا آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ابھی اپنی زمین، اپنے ملک، اپنے شہر اور اپنی گلی کی پوری تفصیلات موجود نہیں۔ کائنات کی تحقیق کی دہلیز تک نہیں پہنچے۔ ابھی سیر افلاک سے آشنا نہیں ہوئے۔ اپنے امراض پر قابو نہیں پا سکے، اپنے مسائل کو حل تو کیا، ترتیب نہیں دے سکے۔ ابھی غربت و افلاس، رنج و کرب و بلا سے آزاد نہیں ہوئے۔ ابھی ہم دنیا کو انصاف اور اسباب زندگی مہیا کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ ابھی دنیا کے متمدن ترین ملک معیشت کے ہنگامی اقدام سمیٹنے کے قابل نہیں ہوئے۔ ابھی سیلاب و زلازل اور برق و باراں کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں۔ قحط و افلاس کے تسلط سے آزاد نہیں ہوئے۔ ابھی تو ہمارا ڈیٹا بہت محدود ہے اور شناخت صرف مبتدیانہ۔ بھلا اتنی بڑی کائنات کے اتنے بڑے رب کے وجود پر عقل آزمائی کیا کریں۔ یہ موضوع تعجب اور استہزا تو پیدا کر سکتا ہے، کسی حقیقی معلومات سے آشنا نہیں کر سکتا۔ مگر وجود کا جاننا کب ضروری ہے۔ کیا موجودگی کا مکمل ادراک کافی نہیں۔ کیا آثار و شواہد سائنسی تحقیق تک نہیں پہنچے۔ کیا ہم اپنے تجسس کو رہِ یقین نہیں دکھا سکتے۔

اگر ہمارے پاس اللہ کے موجود ہونے کے کافی و شافی ثبوت موجود ہوں تو کیا پھر ضرور ہے کہ ہم اس کے وجود سے نبرد آزما ہوں؟ کیا یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ وہ ہے کہ نہیں ہے؟ کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی جسامت و قدامت کتنی ہے، حلیہ کیا ہے، رنگ و نقوش کیا ہیں؟

انسانی ذہن کا سب سے بڑا المیہ وہ سوال ہیں جن کے حل کی صلاحیت اس میں

موجود نہ ہو۔ وہ سوال جو اس کے دائرہ معلومات سے وراہوں۔ وہ سوال جن کے لیے اس نے کوئی تحقیق اور جستجو نہ کی ہو۔ وہ سوال یقیناً ہر انسان کے لیے آسیب بن جاتا ہے اور اگر اس آسیب پر اس کے انکار و اقرار کا انحصار ہو تو کتنی بڑی حماقت ہوگی۔ بے شمار دانشور اس بحران کا شکار ہوئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ان کا علم علت و معلول کے خارجی مظاہر سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو وجوہ اور اسباب ہمیں نظر آتے ہیں ان کے پسِ پردہ بھی پیچ در پیچ ایسا نظام ہو سکتا ہے کہ جن تک رسائی ہماری اپنی مصروفیات ہی نے محدود کر دی ہے۔ موسیٰؑ و خضرؑ کے معاملات میں علت و معلول کی جو جہت اللہ نے سمجھائی ہے' وہ عقلِ بسیط اور دلیلِ ربانی کا حتمی ثبوت ہے۔ کتابِ حکیم میں وہ مثال کسی عام ذہن اور عمومی ذہانت کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ کیا انسان کو اس سے پہلے اسباب و وجوہ کی اس جہت (Dimension) کا علم تھا۔ یقیناً نہیں۔ ظاہری علوم کی بے بسی واضح ہے مگر اس کی افادیت ہمارے اپنے پس منظر اور ماحول میں واضح۔ مگر دلیل ربانی کے لیے ایسے کسی ذہنی بحران کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو خدا اپنے آپ کو تمام انسانوں پر دلیل غالب کے ذریعے ظاہر کرنا چاہتا ہے' وہ کوئی دور از کار دلیل نہیں تخلیق کرے گا۔ ہر زمانے میں جو بڑا سوال رہا' پیغمبر انہی کا جواب دیتے رہے۔ یہ اور بات کہ انکارِ خداوند انسان کا طریقِ فکر کبھی نہیں رہا۔

بظاہر مذہب مختصر نظر آتا ہے۔ انسانی معاشرہ پر تین بڑے پیغمبروں کا اثر واضح ہے۔ موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ۔ پیغمبر تو شائد شمار بھی نہیں کیے جا سکتے۔ خاص کر اس قولِ ربانی کے بعد کہ ہر دورِ زماں میں اللہ نے کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا جب تک اس میں رسول نہیں بھیج لیے اور ہدایت نہیں فرمائی اور اس پر مستزاد یہ کہ اسی قوم کی زبان میں مختلف مذاہب میں کچھ نام اب بھی اسی عزت اور برکت کے حامل ہیں جو پیغمبروں سے مخصوص ہوئی ہے۔ رام چندر اور کرشن، زرتشت، پلاٹینس، تاؤ، بدھ یہ وہ چند بڑے نام ہیں جن کے انداز حکیمانہ اور عادات پیغمبرانہ ہیں۔ ان کی تعلیمات کا مسخ ہونا بھی ہمارے سامنے ہے۔ اشوک نے جو ظلم بدھ کی تعلیمات سے کیا اور ”بھگوت گیتا“ کے مصنف کو جس طرح خدا بنایا گیا اور رام چندر کو جیسے الوہیت بخشی گئی، اس سے ظاہر ہے کہ مسخ شدہ ہندو ذہنیت کو منو کی وحدانیت کی تعلیم کے باوجود شرک و کفر کی طرف رجعت برقرار رہی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وحدانیت یہودیت سے شروع ہوئی۔ آدمؑ اور نوحؑ کی اولاد کے لیے وحدانیت تو بھولی بسری داستان نہیں تھی۔ جبلی اقدار اور مذہبی امراء کی جاہ پرستی اور زر و مال کی ہوس نے خدائے مطلق کی تقسیم کا عمل شروع کر دیا۔

مذہب کی سب سے بڑی مخالف قوت یہود ہے۔ مذہب کے آفاقی پیغام کو محدود کرنے اور تعصبات کی تخلیق میں اس قوم نے ابتدا بھی کی اور انتہا بھی کی۔ اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے پیغمبروں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کیا اور کتابوں کی تحریف کو اپنا مسلک بنا لیا۔ یہود بحیثیت قوم کے ایک ایسا پیراسایٹ (Parasite) پودا نظر آتا ہے‘ جس نے اپنے تحفظ کے لیے مذہب کو پُر اسراریت اور جاہ پرستی کا آلہ کار بنایا۔ اپنی نسل سے مذہب کو آگے بڑھنے نہ دیا اور خدا کو دوسری اشیاء کی طرح ذاتی ملکیت تصور کیا۔ اپنی عادات خدا کو بخشیں اور تصور خدا کی حدود متعین کیں۔ اپنے ذاتی تحفظ کے لیے دوسری اقوام پر نہ صرف انحصار کیا بلکہ ان میں تخریب کاری کا ہر حربہ آزمایا۔ یہود ہی وہ قوم ہے جس نے خدا کی تلاش کو نہ صرف محدود کیا بلکہ مذہبی نفرت کو فروغ دیا۔ اگر قوم یہود عیسیٰؑ کو پیغمبر مان لیتی (جو انہی میں سے تھے) اور عیسائیت کو الہامی مذہب کا تسلسل سمجھتی اور عیسائیت بھی اسلام کو ماننے سے اجتناب نہ کرتی تو مذہب ایک فطری ترقی کو پہنچتا اور انسانیت کبھی تقسیم نہ ہوتی۔ یہ وہ بڑا جرم ہے جس کی سزا ان کو پہلے بھی ملی ہے‘ آج بھی مل رہی ہے اور اس کا انجام ان کے مکمل خاتمہ ہی پر ہے۔

یہود عمومی طور پر ایک متعصب اور جاہل قوم ہے۔ اَن گنت معجزات جو جناب موسیٰ سے ظاہر ہوئے‘ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی جاہلیت، انانیت اور زر پرستی کو طاقت ور ردِ عمل چاہیے تھے۔ فرعونِ مصر پر تو آفات، نیل کا انشقاق، طورسینا کو سر پر اُٹھانا، صحرائے سینا کے مصائب، باہمی قتل یہ وہ جبری اقدام تھے جو ان کے تساہل اور زر پرستی کو ختم کرنے کے لیے وارد کیے گئے۔ مگر ان کی مراجعتِ جبلت جاری رہی اور اب تک ان کی فطرت کی

اصلاح نہ ہو سکی۔

عیسائیت بظاہر صلح جوئی اور انکسار و تسلیم کا مذہب تھی، مگر ان میں بھی ابتدائی طور پر یہودیت کا ایک بھاری عنصر موجود تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس عنصر نے اپنی بنیادی خصلتوں کو رجوع کیا اور یہود کی طرح ہی اسلام کا انکار کیا۔ تلاش کی مثال تو واضح ہے۔ یہ تو سلمانؓ اور ابو ذرؓ کا سفر ہے۔ خدا کو چاہنے والے مذہب کو صرف طریق اور راستہ سمجھتے ہیں۔ مقصد اگر خدا کو پانا ہو تو کوئی مذہب بھی اس میں رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہے گا۔ مجوسیت سے یہودیت، یہودیت سے عیسائیت اور پھر اسلام۔ سلمان فارسیؓ نے تلاش کے اصول مرتب کئے۔ مسافر منزل کے بغیر کہاں رکتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت نے مقاصد مذہب تبدیل کر دیے اور خدا کی تلاش کی بجائے مذہب کو ایسا ادارہ بنا لیا جس کے اصول ان کی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق ہیں۔ علم تعصب کی نذر ہو گیا۔ آفاقیت محدود ہو گئی۔ اللہ کو ان مذاہب سے نکال دیا گیا اور ربی اور پادری کا ملکیتی نظام شروع ہو گیا۔

ادھورے علم سے مقصد کہاں حاصل ہوتا ہے اور شناخت کہاں پوری ہوتی ہے۔ اسلام نے کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ پہلا مذہب تھا یا ہے' بلکہ اس نے تمام مذاہب کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں خدائے واحد کی تلاش کے مراحل قرار دیا۔ پہلے مذاہب کی دستاویزات دوبارہ مرتب کیں۔ ان میں رطب ویابس خارج کیا۔ پیغام کی صحت فرمائی۔ غلط اعداد و شمار درست کئے اور واضح طور پر بتایا کہ اب جملہ الہامی کتابوں کی درست ترین روایت قرآن ہے۔ اب اگر کسی کو خدا اور مذہب ڈھونڈنا ہے تو اسے ہدایت اور سبیل صرف

قرآن ہی بخش سکتا ہے۔ محمد رسول ﷺ کے بعد کسی پیغمبر نے دنیا پر ایسے اثرات مرتب نہیں کئے جسے بڑے انسانی معاشرے کا مذہب قرار دیا جائے۔ کوئی ایسی کتاب نہیں آئی جسے الہامی قرار دیا جائے۔ یہ باب اختتام کو پہنچا۔ اب معجزات کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ انسان علم وعقل کی ترقی پر نازاں ہے اور بلوغتِ فکر کو پہنچ چکا ہے۔ آج کے انسان کے لیے کم فہمی اور کم علمی عذر نہیں رہی۔ سربستہ رازوں سے آگہی، تحقیق وجستجو کے بے شمار معجزات اور اجرامِ فلکی میں دراندازی، جزائرِ ارض کی کشادہ جہل اور پُراسراریت کی نقاب کشائیاں غرورِ عقل نے انسان کو اپنے وجود کی نئی آگاہی بخشی ہے۔ آج کے ابراہیم کا چیلنج مختلف ہے۔

پہلے انسان نے شرک کو شعار بنایا تھا، وہ ہر شے میں خدا ڈھونڈتا تھا اور ہر شے کو خدا بنالیتا تھا۔ آج کے انسان نے شرکِ مظاہر کو ترک کر دیا ہے۔ اب وہ خود اللہ کا شریک بننا چاہتا ہے۔ حریتِ فکر اور آزادی جمہور کو الہیاتی اخلاقی بندشوں سے گریز ہے۔ اللہ کا تصور پیرِ تسمہ پا کی طرح اپنے کندھوں کا بوجھ لگتا ہے۔ غلطی اور غلط فہمی یک جان ہو چکے ہیں۔ خدا کو وہ عہدِ قدیم کی داستان سے زیادہ وقعت دینے کو تیار نہیں ہے۔ بے شمار دوسرے ناقص تصورات کی طرح وہ تصورِ خدا کو بھی اپنی ترقی وتمدن کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو قدیم تصورات وہ تحقیق وجستجو سے ناقص یا باطل قرار دے چکا ہے، اس کا جواز تو اس کے پاس علمِ حقائق کی صورت میں ہے مگر تصورِ خدا کو وہ بغیر تحقیق باطل قرار دینا چاہتا ہے۔ وہ اس کو نفسیاتی تسلی کے طور پر تو برقرار رکھنا چاہتا ہے مگر اپنے افکار ونظام میں اسے مداخلت دینے کے حق کا قائل نہیں۔ کیا انسان خدا کے وجود کا قائل ہے؟ نہیں۔ مگر کیا اس انکار کی بنیاد کسی حکمت ودانش پر ہے؟ بالکل نہیں۔ اللہ کے موضوع پر تمام گفتگو بچگانہ

انانیت پر مشتمل ہے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں کہ اسباب تخلیق کیے گئے۔ نہ اس بات کا قائل ہے کہ وہ خود تخلیق کیا گیا ہے۔ نہ وہ اپنی تخلیق کے مقاصد کو قابلِ غور سمجھتا ہے۔ نہ وہ اپنی زندگی پر کسی احتساب کی گنجائش سمجھتا ہے۔

یہ فتنۂ عقل عجیب ہے۔ اتنی وسیع و عریض کائنات میں صرف اپنی زمین اور اپنے آپ کو موجود سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ افلاک، یہ زمین اور اس کا وجود اور شعور صرف ایک حادثہ ہیں۔ اس کا شرفِ انسانیت صرف ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ معجزہ جو شائد دوبارہ کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کا انسان ایک مرتبہ کے معجزہ تخلیق کا تو قائل ہے مگر کسی ایسے حادثہ اور واقعہ کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا جس کی وجہ یہ زمین، وجود اور یہ انسانی معاشرہ کسی کائناتی تغیر سے تہ و بالا ہوسکتا ہے۔ حقائق کی نظر سے اس کا امکان اس کی خوش فہمی سے کہیں زیادہ ہے۔

زمین کبھی اتنی آباد نہ تھی جتنی اب ہے۔ مگر اس آبادی میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ مذہب پھر ایک عذر ناقص کی طرح انسانی تقسیم کا سبب بن چکا ہے، مگر مذہب اصل وجہ نظر نہیں آتا۔ زمین و اسباب کے محدود ذخائر بالاتر اقوام کی نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ تعصباتِ دین و مذہب کی اوٹ میں خودغرضانہ عزائم اور جبر و استبداد کی نئی نوآبادیاں قائم ہورہی ہیں۔ آرام و سکون تو ناپید ہے مگر ذرائع حیات کے قبضۂ غاصبانہ کی جنگ حدِ احتیاط سے آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ انسانوں کی بقاء کا انحصار ایک دوسرے کی فنا پر بڑھ رہا ہے۔ فطری عوامل صرف ایک ہی منزل کو بڑھ رہے ہیں۔ تباہی اور ہلاکت کا فتنہء آخر زماں

جناتی وائرس کی طرح انسانی حلقوم تک پہنچ رہا ہے۔ انجام بڑا واضح ہے مگر انجام سے بچنے کی عقل ناپید۔ بدقسمتی سے ہلاکت کے آلات اور معیار بہت مختلف ہو چکے ہیں۔ اب بستیوں کی بربادیاں آسان، مکمل اور سریع الوقت ہیں۔ پہلے خلائق بربادی دور سے نابود ہوئی تھیں، اب نارِ جہنم کی نذر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ زندگی مکمل غیر محفوظ ہو چکی ہے اور جو اقدامات اسے محفوظ کرنے کے لیے اٹھائے جا رہے ہیں، وہ چنگاری کو الاؤ میں بدل رہے ہیں۔ وقت ہاتھ سے نکلتا نظر آتا ہے مگر بےبسی یہ ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ مجھے آیتِ قرآن یاد آتی ہے کہ ''زمین و آسمان ہم نے ایک خصوصی انداز سے بنائے ہیں اور یہ ٹل نہیں سکتے اور اگر یہ ٹل جائیں انہیں ہمارے سوا روکنے والا بھی کوئی نہیں۔''

ابراہیمؑ اللہ کے دوست ہیں۔ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس سے بہتر عزت و کرم کا تصور موجود نہیں، مگر کیا یہ دوستی محض ایک یکطرفہ اور Unqualified چناؤ ہے؟ کیا اس دوستی کے اعزاز کی بخشش کے پس منظر میں خدائے مطلق کی صرف ذاتی پسندیدگی ہے؟ ایسا لگتا نہیں۔ ابراہیمؑ ایک ایسے انسان ہیں جنہوں نے خدا کے انسان پر اعتماد کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ ابراہیمؑ تاریخِ انسان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے نعمتِ عقل اور امانتِ شعور کو اس کے ترجیحی مقصد تک پہنچایا ہے۔ علوم و فلسفہ کے دور سے بہت پہلے روما اور یونان کے فلسفیوں اور دانشوروں سے بھی بہت قبل میسانک (Mesonic) دور کے آباد معاشروں سے پیشتر ابراہیمؑ عقل و معرفت کے مسلمہ قوانین کے تحت ایسی تحقیق کا آغاز کر رہے ہیں جو آج کے دور میں بھی مفقود ہے۔ ابراہیمؑ کی قوم ستارہ پرست تھی۔ خدا کا انکار کرنے والی نہیں تھی بلکہ بے شمار خداؤں کا اعتراف کرنے والی تھی۔ ابراہیمؑ کے دور میں انسانوں سے زیادہ بتوں کے انساب تھے۔ ابراہیمؑ اس دور میں حقیقت کے جاننے کا عزم لے کر اُٹھے ہیں۔ انہوں نے منطق استقرائیہ اور استخراجیہ دونوں کا استعمال کیا۔ بڑے معروضی انداز سے حالات اور عبادات کی رسوم کو پڑھا، جانا اور سمجھا۔ جس بت کو وہ پاؤں کی ٹھوکر سے زمین

بوس کر سکتے تھے' وہ اسے خدا ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میرا خدا کیا ہوسکتا تھا۔ ابراہیمؑ نے ایک مفروضہ تخلیق کیا۔ ''خدا زوال پذیر نہیں ہوسکتا''۔ اگر واقعی کوئی ایسی مکمل ہستی موجود ہے جس کے پاس کائنات کا اقتدار اعلیٰ ہے تو اسے کسی بغاوت اور زوال کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اس ایک مفروضے کو سامنے رکھ کر ابراہیمؑ نے جانچ پرکھ کا عمل شروع کیا۔ ستارہ اور چاند اور سورج کی امثلہ کو سامنے رکھا۔ ہر چیز کو مجبور اور زوال پذیر پایا۔ شعور نے مجبور کو خدا ماننے سے انکار کر دیا۔ دل نے اس قادرِ مطلق کی طلب کی جس کو ان کے خاندان اور معاشرے نے تماثیل میں بانٹ رکھا تھا۔ مسلسل غور وفکر اور جستجوئے حق نے انہیں عرفان و یقین کی وہ نعمت عطا کی کہ پھر نارِ نمرود بھی اس یقین و اعتماد کو مجروح نہ کر سکی۔ اللہ کو ابراہیمؑ پسند آ گئے۔ انسان کی تخلیق سے اللہ کی مراد یہی تھی۔ غور وفکر سے رشد وہدایت پانا۔ علم و حکمت سے اللہ کی پہچان کرنا اور ذکر وفکر سے قربتِ خداوند کی آرزو کرنا۔ ابراہیمؑ کامیاب ہوئے۔ انعام اللہ کی دوستی ہے۔ یہ دوستی کبھی محدود نہیں ہوئی۔ ہر صاحبِ شعور سے اللہ کو یہی توقع ہے۔ مگر ظالم اس دعویٰ پروردگار کو باطل کرنے کے درپے ہے۔ ظالم کا سب سے بڑا وصف جہالت ہے۔ چاہے وہ دنیا بھر کی تعلیمی ڈگریاں سمیٹے ہوئے ہو۔

میں سوچتا ہوں۔ آج دنیا کی درسگاہوں میں جب اس ابتدائی اور اہم ترین سوال کی گنجائش ہی نہیں تو صاحبِ عرفان کہاں سے اٹھیں گے۔ شیطان اپنے اعمال دہرا رہا ہے۔ گناہ وثواب سے اللہ کو کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ یہ تو ثانوی مسائل ہیں۔ شیطان کو زنا و شراب کے اعمال میں کتنی فتح نصیب ہوسکتی ہے' جب کہ انسانوں کی کمزوریوں کی حدود اللہ نے کتاب میں مقرر کر رکھی ہوں۔ شیطان کو اس برائی سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے جو انسان کی

پشیمانی کو توبہ کی صداقت اور اللہ کی بخشش تک پہنچائے۔ شیطان کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ انسان سے گناہ کرائے گا۔ اس کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ نسلِ آدم کو اغوا کرے گا۔ اسے راہِ راست سے ہٹائے گا۔ عقل و معرفت کی ترجیحات بگاڑ دے گا۔ انسان کو بنیادی مقصد سے ہٹا کر دنیاوی ترجیحات کی جانب مائل کرے گا اور اللہ کے اس اعتماد کو جھٹلائے گا جو اسے آدم اور اس کی ذُرّیت پر ہے کہ جب بھی انسان عقل و معرفت کی ترجیحات میں درستگی اختیار کرے گا۔ غور و فکر، مشاہدۂ ذات اور فکرِ کائنات سے اپنے رب کو پہچاننے کے قابل ہو جائے گا۔

تعداد کے لحاظ سے شیطان آج کامیاب نظر آتا ہے۔ چھ ارب انسانوں کی اس وسیع و عریض آبادی میں اللہ کی شناخت قصۂ پارینہ ہے۔ بدنی گناہوں کے لیے انسانی سزا و جزا کے قوانین بہت ہیں۔ مگر جس جرم آگہی کے تمام حضرتِ انسان شکار ہیں، اس کا مداوا تو اب شاید مہدی و عیسیٰ بھی نہ کر سکیں گے۔ شاید اسی لیے ایک مکمل ہلاکت، ایک قیامتِ صغریٰ، ایک حادثۂ فاجعہ انسان کا مقدر ہو چکا ہے۔ خدا کو جاننے کی کوشش بھی ایک نفسیاتی عارضہ بن گئی ہے۔

شیطان کے تارِ عنکبوت نے فکرِ انسان کی پرواز محدود کر رکھی ہے۔ یادداشت صرف ثانوی ترجیحات کو سامنے رکھتی ہے۔ نسیانِ زندگی اور آخرت کا مرض بن چکا ہے۔ انسان نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے انسان کو بھلا دیا۔ آسمان ویرانوں کی طرح لگتے ہیں اور زمین بے آب و گیاہ اور چٹیل بیابان، اس لیے شاید ٹی - ایس - ایلیٹ اسے بھی Wasteland (برباد زمین) کہتا ہے۔ مگر یہ کہ انسانی فکر کے بجھے ہوئے شعلوں کی کوئی چنگاری تحقیق و جستجو کا بھڑکتا ہوا الاؤ

بن جائے جس سے ظلمات اور آسیب کی یہ دنیا ابراہیمؑ کی طرح کوئی اور اللہ کا دوست پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے اور اس مستقر میں نکہت ونور کے نئے دور کا آغاز ہوجائے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا دور خارقِ عادت واقعات سے بھرپور ہے۔ جادوگری، سحر اور کہانت کے رواج نے لوگوں کو غیر معمولی تخیل کی طرف پلٹا دیا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ جو دورِ حاضر کی طرح اعداد وشمار کی بنیاد پر ایک عظیم سلطنت خدائی کے دعوے دار بادشاہ اور دنیاوی اسباب و وجاہت کو دیکھتے تھے اور دوسری طرف وہ مقہور و مجبور بنی اسرائیل جن کو غلامی نے صرف خورد ونوش تک محدود کر دیا تھا۔ وہ بنی اسرائیل جنہوں نے پیغمبرانہ عظمتوں کے دن دیکھے تھے۔ اپنی نسلی اور آبائی تحقیر کا تماشا کر رہے تھے اور ان کے پاس کوئی ایسی صورت نہ تھی جس کی مدد سے کہ وہ اس عظیم حادثۂ تحقیر سے بچ سکتے۔ کوئی امید کوئی بھی آرزو انہیں عظیم مصری قوم کے مقابل نہ کرسکتی تھی۔ چہ جائیکہ تن تنہا موسیٰؑ۔ کیا عجب کہ خدا کو خود ان کے مقابل اترنا پڑا۔ اور تاریخِ عالم میں یہ حیرت انگیز معجزہ ہوا کہ تن تنہا ایک شخص نے تین سو برس کی عظیم سلطنت کو سر بہ زمین کر دیا۔ خدا کے بغیر تاریخ اس قسم کے واقعات کی کوئی مثال نہیں رکھتی۔

حیرت کی بات ہے کہ موسیٰؑ کی سچائی کا اعتراف ساحروں نے کیا۔ وہ بصری فریب اور ذہنی سراب کی حقیقت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سحر کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کسی نہ کسی سطح پر حقیقت اور سراب کا فرق جاننے والے تھے۔ اس لیے جب عصائے موسیٰؑ نے ان کے سانپوں کو نگل لیا تو انہوں نے خدائے واحد کی قدرت و

طاقت کا اعتراف کرلیا اور اعتراف بھی ایسا کہ جان اس ادراکِ حقیقت کے بدلے نثار کر دی۔ دریائے نیل کی تقسیم کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی اور شائد کسی وقت انسان کی سمجھ میں بھی آجائے مگر کسی بھی واقعہ کو اس کے زمان و مکاں سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ کل کے بہت سے معجزات آج کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ فراعنہ مصر کی افواج کی تباہی، فرعون کی نعش کی سلامتی کا دعویٰ اور قوم موسیٰؑ کی برأت تاریخ کا مستقل حصہ بن گئے۔ معجزہ بے چارگی کی سب سے بڑی امید ہے۔ عرصہ دراز کی غلامی کے تاثرات تعلیمات سے متاثر نہ تھے۔ حقارت اور محکومی نے بنی اسرائیل کو منفی اور کم تر احساسات کی گرفت میں ڈال دیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قومِ یہود کا ذہنی معیار ہمیشہ پست رہا۔ مکر و فریب، سازش اور جھوٹ نے ان کی اعلیٰ صلاحیت اور اعتماد کو چاٹ لیا تھا۔ وہ اس مجرمانہ احساس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ کسی نہ کسی بہانے اپنے پیغمبروں کے قتل میں بھی ملوث رہے۔ خدا کے احکام کا مضحکہ اڑانا، پیغمبروں کو قتل کرنا، نت نئی حجتیں تراشنا اس منافق ذہن کا کام تھا جو باوجود مسلسل تعلیم و تربیت کے بھی کبھی خدا کا نہ ہو سکا۔ ان کو ترک کیا گیا اور قرعۂ انتخاب بنو اسماعیل کے نصیب میں پڑا۔ عیسیٰؑ کی زندگی اور موت خارقِ عادت ہیں۔ ان کا ہر لمحۂ حیات معجزہ ہے۔ ان کا واسطہ متشدد مذہبوں سے تھا جو ہر حال میں اپنے آپ کو مقدس جانتے تھے۔ انتہائی گہرا نفاق، تمرّد و سرکشی، فخر و مباہات، نسلی غرور گویا شیطانی ذہنیت کے بالکل ہم آہنگ۔ ان کے لیے دین میں تصوف کے پہلو کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ موسوی مذہب کی تعلیمات کو جس طرح چاہتے استعمال کرتے اور مقصد برآری کے لیے دین اور دنیاوی وجاہتوں کا ایک عنصر ہو چکا تھا۔ علم اور ظاہری عبادت میں وہ پورے تھے۔ بلکہ بہت سوں

سے بڑھ کر تھے۔ مگر آج کی طرح تمام مذہب، تمام عبادت اشتہائے ذات کو فروغ دے رہی تھی۔ عیسیٰؑ کے تمام معجزات ان کو تسلیمِ ربانی کا دوسرا رخ دکھانے کے لیے تھے۔ مگر اعتراف کی بجائے حسد و کینہ نے لے لی اور وہ پیغمبر کی جان کے درپے ہوئے۔

ربّ کریم کو انسانی تجربات میں صدیاں بیت گئیں۔ اب وہ بھی حیرت اور تعجب کے مظاہر کی بجائے غایتِ تخلیق تک آن پہنچا تھا۔ مقصودِ حیات انسان شناختِ پروردگار جو ٹھہری تو معیارِ عقل کے سوا کوئی اور شے اس میں معاون نہیں ہو سکتی۔ ذہنی ترقی مکمل ہو چکی۔ علم پورا کر دیا گیا۔ نعمت (رسالت) تمام کر دی گئی۔ زمانہ مختصر ہو گیا۔ زندگی جبلت کے تناسب کی بجائے عقل کے درجات کے حساب سے مرتب کی گئی۔ محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اللہ کی رحمت کمال کو پہنچی۔ گیند انسان کی کورٹ میدان میں ڈال دی گئی۔ آپ منصف ہو گئے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

معجزات تاریخی حقائق کا حصہ ہیں۔ آج کا انسان ان کی کوئی بھی توجیہ کرے، ان کا انکار ممکن نہیں۔ بعض اوقات تو معجزات کی شہادت لاکھوں انسانوں نے بیک وقت دی۔ آج کا ذہین فطین انسان ان کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ اس دور میں بھی انفرادی طور پر ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کو کسی بھی عقلی معیار سے پرکھا نہیں جا سکتا۔ جب انسان ترقی یافتہ نہ تھا اور علم و معرفت بیشتر وضاحتوں سے تہی تھے تو معجزہ بحیثیت ایک دلیل کے استعمال ہوا۔ اس وقت کے مروجہ حقائق کے خلاف ایک ایسی بات کا وقوع پذیر ہونا جس کا کوئی سبب موجود نہ ہو، کسی ایسی ہستی پر دلالت کرتا تھا جو طاقت و اختیار میں تمام حالات و واقعات میں اپنی مرضی سے تصرف کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ اس اجنبی بالائے اسباب قوت کو پہچاننے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

مگر آج کا مسئلہ یہ نہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل کی گتھیاں سلجھ رہی ہیں۔ آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کا انسان ہر نئے انکشاف پر خوف اور حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کو بڑی دیر لگتی، نئے حقائق کو قبول کرنے میں۔ مگر آج نیا پن خواہش اور جنوں بن چکا ہے۔

سائنس کی ترقی نے حیرت کے اچانک پن کو سمیٹ دیا۔ نئے انکشافات اب روزمرہ کے مشاغل ہو چکے ہیں۔ معروضیت ترقی پذیر ہے اور تخیل کی وسعتیں محدود ہو رہی ہیں۔ اب تو کائناتی حادثے بھی ٹیکنالوجی کی تفسیر بن چکے ہیں۔ مگر شاید یہی طرزِ فکر خدا کو ماننے سے انکاری ہے۔

خدا کے سوا کوئی مسئلہ ذہنی ارتقا سے بالانظر نہیں آتا۔ خدا کیوں ایسا ہے؟ کیا واقعی اس نے زمین پر کوئی ایسی شہادتیں مہیا نہیں کیں، جن سے اس کی معرفت کا سراغ ملتا۔ کیا زمین ان دلائل سے محروم ہے جو اللہ پر حتمی یقین کی بشارت دے سکتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو یک چشم فراست فکرِ وجود کے دوسرے پہلو پر غور و فکر پر آمادہ نہیں۔ یہ فریب ہے، بہکاوہ ہے کہ خود ستائشی کا مکر ہے کہ تمام عقلِ انسان دوسری سمت سے بے بصر ہے۔ یہ نادانی، یہ نسیان تو نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش لگتی ہے، جو حضرتِ انسان کو اس سوال کی طرف مائل نہیں ہونے دیتی جو زندگی اور آخرت کا سب سے بڑا سوال ہے، جس پر ارب ہا ارب سالوں کی زندگی کا دار و مدار ہے، جو اللہ زمین کی تاریکیوں میں بیج اور بالی کی مقدار متعین کر رہا ہے، جو شگوفے کی چمک، پھولوں کی مہک، جھرنوں کی روانی، قوسِ قزح کے رنگین تناسب کے اصول متعین کر رہا ہے۔ رحمِ مادر میں بچے کی پیدائش کا نگران جو زندگی کے ابتدائی خلیوں کی پیچیدہ ترین ٹیکنالوجی مرتب کر رہا ہے، جو ہر واقعہ کو زمانے کے تسلسل میں ترتیب دے رہا ہے، جو مکاں کے ہر ایٹم کو زماں کی ہر جہت میں سمو رہا ہے۔ کیا وہ اس قابل بھی نہیں کہ درسگاہوں کے نصاب میں اس کے بارے میں کسی سوال کی گنجائش رکھی جائے۔ کوئی کتاب اس کے ہونے نہ ہونے کے امکان کا جائزہ لے۔ کوئی حقیقت اور آسیب میں

فرق کر کے بتائے؟ کیا جدید ذہن نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے؟ کیا اس کے بارے میں کوئی حتمی وجہ، ڈگری یا قانون بن چکا ہے؟ کیا یہ انفرادی مسئلہ ہے؟ کیا معاشروں اور اقوام کی تاریخ اس کے تصرف سے مبرّا ہے؟ کیا وہ ایک ایسا خیال ہے جو عمومیت کا درجہ نہیں پا سکتا؟ کیا وہ محض ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو چند اذہان کی کروموسوم کی بے ترتیبی کی پیداوار ہے؟ اگر نہیں تو پھر اتنے اہم سوال کو کم تر ترجیحات میں کیوں ڈال دیا گیا۔ انسان نے اپنے آپ کو اتنا بڑا دھوکا کیوں دیا۔ دعوئ شیطان سچا نکلا۔ وہ انسان کی توجہ کو اغوا کر چکا ہے۔ پہلے وہ خدا کے مقدس نام کو بتوں کی پلیدی سے بدل دیتا تھا۔ اب تو اس نے بہت بڑی فتح حاصل کر لی ہے۔ ذہنِ انسان کو منزل کے تعین ہی سے بے خبر کر دیا ہے۔ اس راستے ہی سے ہٹا دیا جہاں کسی طور شناختِ منزل کا امکان ہو سکتا تھا۔ انفرادی توجہ تو قیامت تک جاری رہے گی مگر کیا انسان مجموعی طور پر بھی کبھی رجعتِ مقصد اختیار کرے گا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ مجموعی طور پر پوری نسلِ انسان ایک المیہ سے گذری۔ یہ صدمہ کرب و بلا پر مشتمل نہ تھا بلکہ وجود کے تساہل اور اختیار فکر کا تھا۔

انسانی فکر کی طویل تاریخ ایسی کسی سرعت سے آشنا نہ تھی جو اسے پچھلے سو سال سے نصیب ہوئی۔ کیا وہ بیمار جو سُست الوجود ہوا اس کے ذہن کی تیز رفتاری اسے خواب عظمت کا شکار نہیں کر دیتی۔ وہ سست رو قافلۂ انسان جو ہزار ہا سال سے معدودے چند ایجادات پر قائم تھا اور گنے چنے مسائل کا شکار تھا' جب ایک انتہائی تیز رفتار ذہنی ارتقاء کا شکار ہوا تو اجتماعی خوابِ عظمت کا شکار ہو گیا۔ اس حادثۂ ذہن نے جسے میں اجتماعی خواب عظمت (Collective Schizophrenia) کا نام دوں گا۔ انسان کو نئی جہالتوں سے

روشناس کرایا۔ جہاں مسائل کی نوعیت بدلی' وہاں ذہنی امراض کا پنڈورا بکس بھی کھل گیا۔ جہاں نئی ایجادات، نئے کام، نئے پیشے، نئی مہارتیں پیدا ہوئیں وہاں اس تیز رفتار ذہنی ارتقا کی بدولت ذہن کے تازہ امراض بھی شناخت میں آنے شروع ہوئے۔

Schizophrenia کا علاج تو آپ جانتے ہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں اگر اس قسم کے مریض کو الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی دی جاتی تھی تو آج کے زمانے میں بجلی کے شاک اس کا علاج ہیں۔ انسان اس تیز رفتاری سے نڈھال ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ تو اس ترقی کا ساتھ نہیں دے رہے۔ کچھ اس کے خوف میں مبتلا ہیں اور جو تیز قدم ہیں وہ مکمل ذہنی بحران کا شکار ہیں۔ اس مرض کا علاج تو اب اجتماعی حادثہ لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری نسلِ انسان الٹی لٹکائی جائے گی اور مرچوں کی دھونی دی جائے گی۔ خدا ہے تو واپسی ہے، نہیں ہے تو مکمل فساد و خرابی۔ خبط عظمت میں بھلا انسان اپنے سوا کس کو خدا مانے گا۔ یہی دجال کی تعریف ہے۔ کتنے ہوشمند اور کتنے پاگل۔ یہ فرق تو وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے وسعتِ دامن فکر میں رفتارِ زمانہ کو سمیٹ رکھا ہے' جو اس دورِ پُرآشوب میں بھی کسی مضبوط سہارے کی پناہ میں ہیں۔ جو خوف اور حزن کو سمیٹ رہا ہے' جو اجتماعی Arthritis میں بھی چلنے کی توفیق دے رہا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اس کے تو کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔ اس کا یقین کیسے آئے۔ اللہ ان انٹلیکچوئل بونوں سے بیزار ہے۔ اس کی عظمت بازاری ذہانتوں کے طعن و تشنیع کا شکار ہے۔ خدا سے بڑا صبر والا کون ہے۔ زمانوں میں اپنی تکذیب کا خود گواہ رہا۔ قادرِ مطلق جو ٹھہرا۔ وہ اتنا بڑا، ہم اتنے چھوٹے۔ کتنے ہی لوگوں نے اس کی عصمتِ دامنِ الوہیت پر کیچڑ اچھالا۔ بہت سوں نے اس کی غیرتِ انتقام کو للکارا۔ نسل در نسل انسان

نے بے بصر اور خود فریب تعقل سے اس پر الزام تراشیاں کیں، مگر وہ خدا کو عجلت میں نہیں مبتلا کر سکے۔ برباد زمین، اجڑی ہوئی بستیاں، سوکھے ہوئے کنویں عبرت کا سامان نہ بن سکے۔ انسان کو سادہ لوح کہنا مشکل، انسان کو انسان کہنا بھی مشکل ہے۔ یہ تو شیطانی سراب میں مبتلا سراسیمہ و حیران آسیب زدہ پتلے ہیں جو اپنے خواب شیطان کو بیچ چکے ہیں، جنہوں نے امیدِ رحمت کو خود فراموشی کے عوض فروخت کر دیا ہے۔

کیا واقعی اللہ کے لیے دنیا میں کوئی اعداد و شمار، کوئی ڈیٹا نہیں۔ میں اس فلسفیانہ بحث و مباحث کی بات نہیں کر رہا جو انسان نے جدلیات اقرار و انکار میں مرتب نہیں ہیں۔ اول و آخر یہ مباحث تو جاری رہے، انکار کرنے والوں کو کبھی انکار کا حتمی یقین حاصل نہیں ہوا اور اقرار کرنے والوں کے پاس بھی منطقی مفروضات کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک دانشور اگر اقرار کی دلیل لاتا اور دوسرا اس کو رد کرنے کے درپے ہوتا۔ جو دلائل بھی فلسفہ اور علم الکلام نے پیش کئے، وقت کے ساتھ کم علمی کا معیار بن گئے۔ ابھی کل ہی تو اقبالؔ الوہیت کے دفاع سے فارغ ہوئے تھے اور آنے والے کچھ برسوں میں وہ تمام دلائل تازہ ابہام کا شکار ہو گئے۔ انفرادی یقین کے لیے تو کوئی بھی وجہ خدا کا اقرار بن سکتی ہے۔ بے شمار لوگ اسے دعا کے رشتے سے پہچانتے ہیں۔ ضرورت اور ابتلاء خدا کی تسلیم میں سب سے مؤثر دلیل بن جاتی ہیں۔ کچھ لوگ حادثات سے تلقینِ رشد و ہدایت پا لیتے ہیں۔ زندگی کی تھکن اور موت کا خوف بذاتِ خود بہت بڑی وجہ تسلیم ہے۔ فطرت کے مظاہر بھی خالق کا تاثر دے جاتے ہیں۔ شعورِ کائنات اور شعورِ ذات دانشوروں کی توجیہات کسی خالق و مصور کو مبذول کر دیتے ہیں، مگر یہ تمام باتیں دلیل نہیں بنتیں۔

یہ ویسے دلائل نہیں جیسے حضراتِ سائنس آپ کو وجود کی تسخیر کی وضاحت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ تو انفرادی احساس ہے جو شاید پہلے سے اعتبار کے لیے تیار ہو اور اسے ایک آدھ بہانہ تسلیم مل جاتا ہے۔ بیشتر اقرار میں ذہن تقلیدی رجحان اختیار کرتا ہے اور زحمتِ تحقیق نہیں پسند کرتا۔ عمومی یقین نسلی تقلیدی اور جبری ہے۔ بہت سے علمائے مذہب بھی اصولِ مذہب پر تنقید کا جواب دے لیتے ہیں۔ مگر شاید اس بنیادی سوال کا کوئی جواب نہیں رکھتے جو لادین عناصر خالقِ مذہب پر روا رکھتے ہیں۔ ذہانتوں کے اس مقابلے میں تشکیک غالب آتی ہے۔ کیونکہ تشکیک کے دانشور بہر حال کچھ سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر مذہبی جواب ہمیشہ خوف اور بے اعتباری کا حامل ہوتا ہے۔ مذہبی علماء کی اس بے بسی کی وجہ سے لادینیت کو دین پر غلبہ مل جاتا ہے۔ مگر کیا واقعی خدا کے لیے کوئی ناقابلِ تردید دلیل اور توجیہ عقل نہیں؟

آئیے دیکھیں کہ زندگی کن بنیادی حقائق پر مبنی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اور حیات بعد الممات سے لے کر ابدی حیات تک صرف دو نظریات موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی حادثہ ہے، اتفاقیہ ہے اور حسنِ اتفاق یہ ہے کہ انسان بہترین مخلوق ہے۔ اس کی دوسری مخلوقات پر برتری کا سبب اس کا دوسری مخلوقات پر ذہنی تفوق ہے۔ انسان اس عجیب و غریب حادثہ کے لیے کسی کا مرہون منت نہیں ہے، کیونکہ کوئی ایسی قوت موجود ہی نہیں ہے جس کا وہ شکر گذار ہو۔ اپنے قوانین زندگی اور کارکردگی میں وہ مطلق آزاد ہے۔ اس کی ہدایت اس کے تجرباتِ حیات اور بہتر شعور پر مبنی ہے۔ وہ اپنی حفاظت اور ہلاکت کا خود ذمہ دار ہے۔ انسان کی منزل آخر میں یہ ہے کہ زمین کے ذخائر ختم ہونے سے پہلے یا کسی اور کائناتی حادثے سے قبل اس کو کسی اور محفوظ سیارے پر منتقل ہونا ہے۔ لیکن اگر پوری کائنات کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو فطرت عالیہ کا یہ حسنِ اتفاق ایک شہادتِ کبریٰ کا شکار ہو جائے گا۔

اخلاق انسان کی ذاتی ذمہ داری ہے اور اگر سارے انسان مل کر اخلاقیات کے

انداز بدلنا چاہیں تو چونکہ لادینی جمہوری معاشرہ بہترین اور اکثریت کی رائے کے احترام پر مبنی ہے اس لیے ان کا حق ہے کہ وہ تمام قوانین جو انسانی تہذیب کو مدتوں سے کم علمی کی بناء پر گناہ وثواب کے مسائل میں جکڑے ہوئے ہیں' ان کو ختم کریں اور صرف وہی قوانین مستعمل ہوں جو سرمائے کا تحفظ، ذاتی آزادیوں کا احترام اور طاقتور قوتوں کے مفاد کو سلامت رکھیں۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ تمام دنیا ایک طاقتور ملک کی سیادت کے سائے میں جیے اور اس طاقتور ملک کو خدائے زمین ہونے کا اختیار حاصل ہو اور باقی قوتوں کو فلسفہ ہائے حیات اور محنت کو ترک کر کے اس کی مکمل متابعت اختیار کرنی چاہیے۔ اس کے عوض وہ انہیں حفاظتی آثار عطا کرے اور ان کے رزق اور ملازمت کا بندوبست کرے۔ ان کا بیماریوں کے خلاف تحفظ کرے۔ دنیا اس کی باج گذار نہیں تو کم سے کم ٹیکس گذار ہو۔ یا یہ کہ دنیا ترقی یافتہ، کم ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں تقسیم ہو اور ترقی یافتہ ممالک کو حق حاصل ہو کہ وہ پس ماندہ قوموں کی ترقی کے عوض ان میں اپنا اخلاقی، معاشی اور سماجی نظام نافذ کر سکیں۔ اقوام عالم کی تقسیم کا محض ایک معیار ہو اور وہ تہذیب یافتہ بہتر معیشت والی قوموں کی برتری۔ اس میں اختلاف رکھنے والے لوگوں یا اقوام کے ذاتی' علاقائی یا قومی تعصبات کو یا تو مکمل طور پر جاہلانہ اور متعصبانہ قرار دے کر رد کر دیا جائے یا تو انہیں تہذیب انسان کا مخالف قرار دے کر ان کے خلاف خوف ناک فوجی کارروائیاں کی جائیں' جس سے ابھرتا ہوا فتنہ مجموعی امن کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

قوت وطاقت چونکہ ایک عملی اور زمینی حقیقت ہے اس لیے اس کا ہر حال میں احترام کیا جائے۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب پوری زمین ایک حکومت، ایک ملک اور

ایک اندازِ زندگی کے قابل ہوجائے گی تو انسانی معاشرہ انصاف، ہمدردی، رزق و روزگار کی آسائشوں کا گہوارہ بن جائے گا۔ یہ وہ خواب ہے جس کو سب انسان دیکھتے چلے آئے اور یہ خواب کسی فوجی قوت کے یکطرفہ قانون ہی سے پورا ہوسکتا ہے۔ خدا کے بغیر اس نظام میں یہ بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ لوگ اپنے بنیادی تخلیقی حقائق پر قابو پالیں گے۔ ان کے اندر وہ تمام نفسی کیفیات جو شخصی یا اجتماعی امن کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ نفسیاتی تحلیل، برین واشنگ یا قانونی جبر سے دور ہوجائیں گے اور یہ متنوع اور بے قابو نسلِ انسان اعداد کی ایک لسٹ کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ خدا کے بغیر اس دنیا کی ترقی تسخیرِ عالم کو بڑھے گی۔ کائنات میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ بے پناہ ذرائع کی مالک ہوجائے گی۔ ذرائع مواصلات میں ناقابلِ یقین رسوخ حاصل ہوگا۔ تولیدی طریقۂ کار بدل دیا جائے گا۔ بہتر اور کار آمد انسانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے گا۔ زندگی اور موت کی پابندیاں اگر ختم نہیں تو کم ہوجائیں گی۔ اموات پر قابو پالیا جائے گا اور غیر ضروری پیدائش شروع ہی سے روک لی جائے گی۔ آگے بڑھتے ہوئے انسان کائنات میں بے خطر نو آبادیاتی نظام قائم کریں گے جس میں انسانی آبادی کی کثرت بھی کم پڑ جائے گی۔ حادثۂ کبریٰ (Big Bang) سے تخلیق شدہ اس دنیا میں اتنی جگہ ہے کہ ہر انسان کو اس کا ستارہ الاٹ ہو سکے۔ جہاں ایک مرکزی نمائندہ حکومت اور متفق الیہ صدارتی نظام کے تحت انسان کائناتی حکومت کا دعویدار ہوگا۔ اس وقت کائنات کے صدر کی قوت اور طاقت کا اندازہ صرف ان صفات سے لگایا جاسکتا ہے جو اس وقت خدائے مطلق کے تصور کو حاصل ہیں۔

یہ خواب بھی ہے اور امکان بھی۔ اگرچہ اس وقت ایک ابتدائی خاکہ موجود ہے

اور شاید اس پر عمل ہوا شروع بھی ہو گیا ہے، مگر اس کی تکمیل میں سب سے بڑا خطرہ خدا کا ہے۔ خدا جو پہلے سے موجود ہو، جس نے پہلے سے کائنات بنائی ہو، پہلے سے انسان اور باقی مخلوقات کو تخلیق کیا ہو۔ نظام حیات مرتب کیا ہو۔ قوانین سے روشناس کرایا ہو۔ زندگی اور موت کو پابند اصول کیا ہو۔ حادثات اور واقعات کو ترتیب دیا ہو۔ ناسوت و برزخ و ملکوت کا مالک ہو۔ جس نے ماسٹر پلان (لوح محفوظ) کے ذریعے ہر ذرۂ تخلیق کا اندازہ مقرر کر رکھا ہو۔ جس نے اپنی حکومت میں کسی کو جرأت مداخلت کا اِذن نہ دیا ہو۔ جو قطعی ہو، حتمی ہو اور کسی بھی رشتے ناطے سے عاری ہو۔ جو کسی وقت بھی انسانی ترقی کے اس خواب کو قیامت سے آشنا کر سکتا ہو۔ جس نے زندگی زمین، حیات انسان اور عمر کائنات طے کر رکھی ہو اور جس کے ہوتے ہوئے وہ انسان نہ آزاد نہ متحرک نہ فعال بلکہ مجبورِ محض ہو۔ دیکھا جائے تو عقل ہمیں اتنا ضرور بتا دے گی کہ آزاد انسان کے تصور آزادی اور جبر مطلق میں خدا حائل ہے۔ اور یہ فیصلہ بہت ضروری ہے کہ خدا ہے کہ نہیں ہے۔ شیخ چلی یا لال بجھکڑ کی طرح ہمارے تمام اندازے، تخمینے، کمپیوٹر اور اعداد و شمار کے مفروضے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اتنا طاقتور مداخلت کار موجود ہو جو ایک پتھر کے Asteroid کے ذریعہ پل جھپکنے میں انسانی عظمت کا خواب چکنا چُور کر سکتا ہو۔ ایک وائرس کے ذریعے تمام اذہان کو سسکتے ہوئے اپاہجوں میں تبدیل کر سکتا ہو۔ ایک جنبشِ ابرو سے دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو الٹا پلٹا سکتا ہو، جو ایک لمحۂ قہر میں اس ترقی یافتہ Homo- Sapiens کو دوبارہ Chimpanzee میں بدل سکتا ہو، جو کسی واقعہ میں یقین نہیں رکھتا، کسی اتفاق کو وقوع پذیر نہیں ہونے دیتا، جو ایسا آمر مطلق ہے کہ دنیا کے جابر ترین حکمرانوں کو ایک تھرمباسس یا ان فاکشن کے جھٹکے سے کار دنیا سے فارغ کر سکتا ہو اور دستِ غالب کے ایک اشارے سے پورے کائناتی حقائق کو

سراب اور تخیل میں بدل سکتا ہو۔ اس خدا کے ہوتے ہوئے دعوئ فضیلت کتنا حقیر لگتا ہے۔ انسانی عظمت اور ترقی کا یہ حریف اگر موجود ہے تو انسان کے پاس کیا چارہ کار ہے؟ دو ہی تو راستے ہیں۔ یا تو اس کو تسلیم کر کے اپنے خواب عزت اور حکومت کو پورا کیا جائے یا انکار کر کے ایک ایسی جنگ چھیڑی جائے جس میں ہلاکت اور جہنم کے سوا کسی دوسرے امکان کی گنجائش ہی نہیں۔ مگر اس سے بھی پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ تمام عقل وفکر کو مرتکز کر کے سوچا جائے کہ یہ خطرہ موجود ہے کہ نہیں۔ کیا ضروری نہ تھا کہ تمام فکرِ انسان اجتماعی طور پر یہ مسئلہ حل کرتی کہ ہم حادثاتی پیداوار ہیں یا کسی خدا کے بندے ہیں۔ مسلسل اور متواتر ایسی شہادتیں انسان کے اندر باہر ملتی ہیں کہ یہ مداخلت کار موجود ہے۔ اگر لفظی اور خیالی شہادتوں سے انکار کر بھی لیا جائے تو ہمیں ایسی جدوجہد تو کرنی چاہیے جیسی شاید ہم ایک ریاضی کے فارمولے کی تحصیل کے لیے کرتے ہیں۔ ایک سائنسی حقیقت کے لیے یا شاید ایک نئے سیاسی نظام کے لیے۔ ہمیں اس بات کا یقین تو کرنا ہے کہ ہم اللہ کے تصور کی جانچ پرکھ کے لیے کسی اصول کے قائل ہو سکتے ہیں۔ یا ہم کس قسم کے شواہد چاہیں جن کی بنیاد پر ہم حتمی طور پر خدا کی موجودگی کے قائل ہو سکتے ہیں یا پھر اس کا مکمل انکار کر سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اللہ پر کسی نے نظری یا بصری شہادت نہیں دی، مگر دی بھی ہو تو کیا نسلِ انسان کے موجودہ منکرین اسے تسلیم کر لیں گے! یوں تو اللہ کے پیغمبر بھی اس کا ثبوت ہو سکتے ہیں، جن لوگوں نے اس کائنات اعلیٰ کی حقیقت سے معرفت حاصل کی اور اس سے رابطے کا دعویٰ بھی کیا اور اس سے احکام وصول کرنے کی بھی شہادت ہے۔ کسی ایسے درمیانی رابطوں کا ذکر بھی کیا جن کو ملائکہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے

علاوہ وہ بیشمار معجزات بھی جو مختلف قوام نے مختلف پیغمبروں کے مبارک ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہوئے دیکھے اور اس کی وضاحت صرف اللہ ہی تھا۔ مگر مسئلہ یہ ہوگیا کہ جدید انسان نے اس اہلیت اور رابطے پر تحفظات کا اظہار کیا۔ اس سچائی کو ذہنی پیچیدگی قرار دیا۔ کچھ نے اسے نفسیاتی عوارض کی شکل میں دیکھا، کچھ نے پیغمبروں کی ذہنی صحت کا سوال اٹھایا‘ جس کے نتیجے میں انسان کی سب سے بڑی سچائی بھی مشکوک ہوگئی۔

کیا اس سوال کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے جس پر ان گنت صدیوں کی زندگی کا دارو مدار ہو۔ انسان ملٹن کی گم کردہ جنت کا شیطان نہیں ہے۔ نہ اتنا بے ہوش و حواس جواری ہی کہ اتنا بڑا داوٗ لگا سکے۔ نہ اتنا احمق ہی کہ خدا کو ماننے کے باوجود اس کے احکام سے پہلو تہی کرے اور اپنے آپ کو رضا کارانہ نارِ جہنم کا اہل قرار دے۔ گر یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہمہ وقتی خوف و ہراس سے کیسے نجات حاصل ہو۔ Damocles کی اس لٹکتی ہوئی تلوار سے انسان کبھی بھی امن اور چین کی برات نہیں حاصل کر سکتا۔ طریقہ کار تو بہت سادہ تھا۔ ہم نے بھی ابراہیمؑ کی طرح ایک ایسا عنوان قائم کرنا ہے جس پر خدائے قدوس کی اصلیتِ وجود و موجود پرکھ سکیں۔ انسان اور خدا میں بڑا فرق ہے۔ انسان تو ہے ہی غلطیوں کا وجود۔ اس میں کچھ حماقتیں ایسی تھیں جن سے اس نے عقل و شعور کی نعمت پائی۔ انسان کسی غلطی یا حماقت سے اپنا انسانی Status ضائع نہیں کرتا۔ وہ ہر حال انسان رہتا ہے۔ جانورانہ پستی اور حسن و ملکوت کی خوبیاں تمام انسانوں کی میراث ہیں اور جملہ انسان خطا و جزا کے ان پہلوؤں سے گذرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم چاہے انہیں کتنے پست ناموں سے پکاریں وہ انسان ضرور سمجھے جاتے ہیں اور سمجھے جائیں گے۔ مگر یہی بات اللہ کے بارے میں

درست نہیں۔ اللہ کی کوئی صفت ایسی کسی کمزوری کی نشاندہی نہیں کرتی جس سے اس کے اللہ ہونے کا امکان شبہ میں پڑتا ہو۔ یہ نہیں کہ اللہ انسانوں کا کوئی ایسا آئیڈیل ہے جسے انہوں نے اپنی خواہشات کے مطابق ہر خطا اور نسیان سے ظلم و تعدی سے، جبر و اکراہ سے، بخل و غضب سے پاک رکھا ہوا ہے اور نسلِ انسان اس تصوراتی خدا کی صفات تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بلکہ جو کوئی بھی اللہ ہے اس میں یہ صفات ذاتی ہیں اور وہ کسی سے بھی کاملیت اور انتہائیت کی بھیک نہیں مانگتا۔ وہ اعلیٰ ترین عقل و حکمت، قدر و منزلت، انصاف و حکومت کا مالک ہے۔ وہ کسی کا مرہونِ منت نہیں، نہ کسی سے اس کا رشتہ ناطہ ہے۔ نہ اس کو انسانی ضروریات سے کوئی ضرورت متاثر کرتی ہے۔ وہ خالق ہے، مطلق ہے اور ہر خطا و نسیان سے مبرّا ہے، اسی لیے وہ اللہ ہے۔ مگر اللہ کا یہ دعویٰ محض فرض کرنے سے نہیں بلکہ حقائق اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ ہر بند گلی کے موڑ پر وہی کھڑا ہے، ہر سوال کا انجام وہی ہے، وہی منزلِ تحقیق، وہی آرزوئے جستجو ہے، وہی انتہائے علم و حکمت ہے۔ ممکنہ طور پر ہم کسی صورت بھی خطا اس سے منسوب نہیں کر سکتے اور کوئی ایسا امکان ہو بھی، تو انسان کے فہم و فراست سے بالاتمام حقائق کی معرفت سے دور۔ وہی جان سکتا ہے کہ وہ کسی ایسی کمی کا مالک ہے کہ نہیں۔ اسی لیے خدا کی جانچ پرکھ کے لیے ہمیں انتہائی موزوں ایک ایسا کلیہ مل جاتا ہے جس سے اس کے دعاوی کی تحقیق ہو سکتی ہے اور جس سے ہم یقینی اور حتمی طور پر اس کی موجودگی کا اثبات کر سکتے ہیں۔ جیسے سیدنا ابراہیمؑ نے ایک کلیہ تخلیق کیا کہ اللہ زوال پذیر نہیں۔ اسی طرح آج کے تمام تر عقلی اور علمی دور میں ہمیں اس سے بہتر کلیہ استخراج کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ ”اللہ کبھی غلطی نہیں کرتا“۔ اور اگر اس میں کسی بھی قسم کی غلطی کا امکان ہو تو وہ کم سے کم اللہ کہلوانے کا حقدار نہیں ہوگا۔ آپ خود غور فرمائیے کہ جس ذات میں ایک غلطی کا امکان بھی

نہ ہو، اگر تمام انسان مل کر اس غلطی کو ڈھونڈ لیں تو کام کتنا سہل ہو سکتا ہے اور بوجھ کتنا ہلکا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تمام دلائل جو اب تک خدا کے وجود و موجود کے بارے میں دیئے گئے، تجریدی تھے۔ ان میں مطلقیت (Exactitude) نہیں تھی۔ ان میں ہمیشہ شک کا امکان رہا۔ اگر خدا خالق تھا تو کچھ لوگوں کے خیال میں فطرت بھی خالق ہو سکتی ہے۔ اگر کائناتی نظام کو اللہ کی صفت قرار دیا جائے تو اسے حادثے سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ہر چیز بڑے ہی پیچیدہ میکنزم سے چل رہی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظام مدتوں کے مادیاتی نظام کے تجرباتی دور سے گذر کر مستحکم ہو چکا ہے۔ اگر کہا جائے کہ کائناتِ اکبر کا نظامِ سیارہ گاں بڑا ترتیب یافتہ ہے تو کہا جائے گا کہ ارب ہا ارب کے حادثاتی ٹکراؤ اور شکست و ریخت کے بعد فطری استحکام پیدا ہو چکا ہے۔

زندگی چند ایسڈز اور گیسوں کے اجتماعی افعال کا اثر ہے، کیونکہ ہم یقین سے کہہ نہیں سکتے کہ کسی اللہ کے وجود کا حتمی اثبات موجود نہیں، اس لیے اور بھی کئی قوتیں کارکردگی کے اثرات رکھتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اس کی تردید کے بھی کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں۔ بلکہ بے شمار ایسے اشارات موجود ہیں جو مسلسل کسی عظیم غیر مرئی قوت کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اس مخمصے سے صرف ایک ہی صورت میں نکلا جا سکتا ہے، اگر ہمیں کوئی یقینی ڈیٹا مل جائے۔ جس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو ہم بڑی آسانی سے اس کی جانچ پرکھ کے بعد اس کی موجودگی کو باطل قرار دے سکتے ہیں۔

بظاہر تمام الہامی کتابیں اللہ کی باتیں اور اعداد وشمار لگتے ہیں۔ اس کے احکام اور ارشادات ہیں، مگر کوئی بھی کتاب کسی پیچیدہ تنقیدی معیار پر پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچی۔ ویدانت، پرانے اپنشد میں وہ فلاسفر تو نظر آتے ہیں مگر کائنات اور دنیا کے بارے میں ان کی تعلیمات ازمنۂ قدیم کے کم تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر نہیں ہیں۔ توریت، زبور اور اناجیل میں بھی جہاں ایک اعلیٰ درجے کا اخلاقی نظام اس کی موجودگی کی خبر دیتا ہے، وہاں ناقص غیر حقیقی مفروضات بھی درج ہیں، جس سے کم از کم وہ خدا نہیں لگتا۔ مگر کیا ان مقدس کتابوں کو اللہ اپناتا (Own) ہے۔ نہیں۔ اللہ کو انسانوں کے اس ذہنی ابہام کا پہلے سے علم تھا۔ اس لیے وہ بڑی وضاحت سے اپنی آخری کتاب قرآن میں ان کتابوں کے مندرجات سے قطع تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کتابوں میں انسانی اطلاعات اور تحریفات کا بڑا عنصر داخل ہو چکا ہے۔ وہ انہیں پیغام ضرور قرار دیتا ہے مگر تحریف شدہ، جس میں حقائق کو یا مسخ کر دیا گیا یا جانے بوجھنے کے باوجود بدل دیا گیا۔ اس لیے وہ اپنی ذاتِ گرامی کو ان کتابوں کے میزان میں نہیں ڈالتا۔ مگر قرآن کے بارے میں وہ بلاشک وشبہ بہت بڑے دعویٰ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ نہ صرف اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ اس کے تمام مندرجات کو تحقیق اور جستجو کے ہر معیار پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ اسے زمانی قید سے آزاد قرار دیتا ہے۔ اس کی مکمل حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ اس کتاب کو ہر قسم کے احتساب فکر کے لیے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ ایک بات جو صدیوں سے اللہ کے ایک دعویٰ کو سچا ثابت کرتی ہے وہ اس کی حفاظت کا دعویٰ ہے۔ پندرہ سو برس سے کسی کتاب کے الفاظ اور فقرات کو اتنی حفاظت نصیب نہیں ہوئی کہ اس میں ایک نقطہ بھر تغیر بھی وارد نہیں ہوا۔ اللہ کے اس دعویٰ کی سچائی کے بعد ہم مجبور ہیں کہ اسے

کلامِ خدا کا رتبہ دیتے ہوئے اس کے تمام حقائق کو عقل وحکمت کے میزان پر پرکھیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اللہ خود عقل اور غور وفکر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے اور اندھے یقین کو جانورانہ اعتقاد کا نام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد انسان اور اللہ میں مفاہمت کا کوئی عنصر باقی نہیں رہتا۔ انسان کو بھی مکمل آزادی ہے کہ وہ بغیر کسی جذبہ عبادت وعقیدت کے، بغیر رعایت ورحم کے اس کتاب کو پوری ذہنی قوت اور جارحیت سے پڑھے۔ اس کی تمام تحقیق وجستجو کا مقصد سادہ اور صاف ہے اور وہ یہ کہ خدا کی ایک غلطی ثابت کرنا۔ صرف ایک غلطی جس کے بعد وہ اللہ ہی نہیں ٹھہر سکتا۔ اتنی بڑی کتاب میں ایک غلطی کا نہ نکلنا امر محال ہے اور اگر واقعی ایک غلطی بھی نہیں تو اس کے مصنف کا ناقابلِ خطا ہونا یقینی ہے اور اس کے اقوال کا سچا ہونا اور اس کے دعاوی کا قائم ہونا اور اس کا اللہ ہونا برحق ہے۔

قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں جو صرف اوامر ونواہی پر قائم ہو۔ قریباً تمام معاملات زندگی سمیٹے ہوئے یہ کتاب سماجی، اخلاقی، تاریخی اور سائنسی حقائق سے گفتگو کرتی ہے۔ ظن وتخمین کے ساتھ نہیں بلکہ حتمی یقین کے ساتھ۔ فرض کیجئے ایک شخص اُس کے اخلاقی اور سماجی قوانین تسلیم کرنے سے عاری ہے اور احکام کی مطابقت سے گریز کرتا ہے تو اللہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ تسلیم بہر حال قبولیتِ فکر ہے۔ اگر باقی حقائق کا تعلق مختلف سائنسز سے ہے۔ ایسی سائنسز سے جن میں انسان بزعمِ خود بہت ترقی کر چکا ہے اور جن میں کچھ حقائق وہ اپنی نظر سے مکمل کر چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ کے تعصباتِ تعلیم قرآن میں حائل نہ ہوں۔ کسی مخصوص موضوع پر گفتگو یا تحقیق سے۔ پہلے اس کے ابتدائی اصول وضع کرنا ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن پہلی کتاب نہیں اور آخری بھی نہیں۔ اللہ کی طرف سے

آخری ضرور ہے مگر کتابوں کی فہرست میں قرآن کے بعد بیشمار کتابیں کتب خانوں کی زینت بنیں۔ قرآن سے پہلے کے بہت مسودات محفوظ ہیں اور جب سے انسان نے سوچنا اور دیکھنا شروع کیا، اس کے قلم اور کلام کے بہت سے شاہکار قرآن سے پہلے بھی موجود تھے۔ یونان کے فلسفی آج بھی معروف و مشہور نام ہیں۔ روما کے مفکر اور سائنسدانوں کی تحقیقات بھی موجود ہیں۔ قرآن سے پہلے بھی پندرہ سو برس کی انسانی تعلیمات موجود ہیں اور بعد کی بھی محفوظ ہیں۔ چاہیے تو یہی کہ قرآن تک پہنچنے سے پہلے ایک مکمل اور تفصیلی جائزہ ان تمام علوم کا لیا جائے جو قرآن سے پہلے موجود تھے اور جن میں ابتدائی سائنسی تحقیقات بھی شامل ہیں تا کہ قرآن کے بارے میں یہ تاثر کہ ازمنۂ قدیم کی آراء کو دہراتا ہے، اس کی تصدیق ہو جائے۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں جو خیالات قرآن سے پہلے تھے‘ ہمارے علم میں ہیں اور قرآن کی تخلیقی آراء بھی پیشِ نظر ہونی چاہیے۔ قرآن کے بعد اور خاص کر پچھلی دو صدیوں میں جو اطلاعات کا سیلاب آیا ہے‘ وہ بھی ہماری نظر سے اوجھل نہیں۔ کیا مناسب نہ ہوگا کہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں وہی اصول اپنائے جائیں جو اعلیٰ ترین درسگاہوں میں کسی موضوع کے بارے میں ہوتے ہیں‘ کیونکہ بہرحال قرآن نہ پڑھنا بہت بڑا خطرۂ عقل ہے۔ قرآن کی غلطیاں اللہ کی غلطیاں ہیں اور اگر ایسا ہے تو نسلِ انسان ہمیشہ کے لیے خدا کے تصور سے نجات پا جائے گی یا کم از کم جس خدا کو بھی پوجے گی‘ وہ عہدِ قدیم کے اصنام کی طرح اس کا اپنا تخلیق کردہ ہوگا۔

مگر ایک بات ہے کہ پرائمری کا طالب علم ایم۔ ایس۔ سی کی کتاب نہیں پڑھ سکتا، نہ اسے اس کتاب کی وضاحت ہی کا حق دیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے کم

ازکم دو علمی معیار ضروری ہیں اور دونوں بنیادی معیارات تعلیمات سے افضل ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے نزدیک قرآن کا اصل معیار کیا ہے اور کیا وہ لوگوں تک قابل رسائی ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ نے لوگوں سے کس معیار کی توقع رکھی ہے، جس پر وہ قرآن کو سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اسی دوسرے معیار سے ہمارا واسطہ ہے۔ غور کیا جائے تو کتاب غور و فکر کے علاوہ ایک اعلیٰ فضیلتِ علمی کا تقاضا کرتی ہے۔ چونکہ موضوعات متنوع اور حتمی ہیں، اس لیے جو انسان بھی اس کی تحقیق کرے، اسے اپنے فہم و فراست میں آخری درجہ علم حاصل ہونا چاہیے۔ جو آیات مستقبل کے بارے میں ہیں اور جن کی تفاصیل آج کے انسان کے علم میں بھی نہیں، ان پر اس وقت تک غور و فکر معطل کیا جا سکتا ہے جب تک انسان وہاں تک نہیں پہنچتا۔ قرآن کے نزدیک متعدد کائناتیں، متعدد انسانی آبادیاں، جنت و جہنم کی وسعتیں اور قیامت کی ہلاکتیں، ملائکہ اور جنات کی مخلوقات، بالائے کائنات کا انتہائی مکمل اور پیچیدہ انتظام، موت و حیات کا داخلہ اور اخراج، حیات بعد الممات ان گنت نظام ایسے ہیں جن تک انسانی عقل ابھی رسائی نہیں پا سکی۔ ظاہر ہے کہ ان پر رائے دینا عقل کی عجلت پسندی ہو گی مگر بہت سے ایسے حقائق ہیں جن کو آج کے جدید ترین معیارات تحقیق و تنقید پر پرکھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی خطا کی آرزو رکھی جا سکتی ہے۔ اللہ نے آفرینش کائنات اور ابتدائے حیات کی بات کی ہے۔ نظامِ سیارگاں کی تفاصیل دی ہیں۔ تخلیق انسان اور تخلیقِ حیات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ پہاڑوں کی حرکت کا ذکر کیا ہے۔ زمین کے کناروں سے گھٹنے کی بات کی ہے۔ آسمانوں کے وسعت پذیر ہونے کی باتیں کی ہیں۔ بادلوں اور پرندوں کا ہوا میں ٹھہرنے کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ بے شمار ایسے حقائق ہیں جن پر کسی وقت بھی یقینی تحقیقی رجحانات سے غور کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک بات کہ وضاحتِ قرآن اور فہمِ قرآن کے

مفسرین کون ہوں۔ اگر معترضین جدید ترین تعلیمات سے مسلح ہوں تو کوئی صاحبِ قرآن ایسا بھی ہونا چاہیے جو قرآن کی تعلیمات بلاشک وشبہ اللہ کی عطا کردہ فراست سے سمجھ سکے اور مطلوبہ وضاحتیں عطا کر سکے۔ بدقسمتی سے اس وقت موجودہ اور قدیم علماء میں سے کوئی بھی ایسا سکالر نہیں جو ہمہ جہتی فکر کا مالک ہو اور قرآنی علوم پر مکمل دسترس رکھتا ہو اور جو مغربی مفکرین کے طریقِ تحقیق سے آگاہ ہو۔ جو فکر اور تعزز اس وقت مغربی ذہن کو نصیب ہے، اس کی وجہ علم وآگاہی نہیں بلکہ معاش اور معیشت کی وہ ترقی ہے جو ان کو علمی تحقیق کے عملی نتائج سے حاصل ہوئی۔ وہ ایسے مقصدیت پرست ہو چکے ہیں کہ وہ کسی غیر سائنسی حقیقت کے ادراک میں قاصر ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آج تک ان میں کسی نے قرآن کو اس پہلو سے جانچنے پرکھنے کی کوشش نہیں کی یا انہیں اس سے روک دیا گیا ہے۔ اگر وہ ذاتی تعصبات سے پست درجہ مذہبی تنافر سے باہر نکلتے تو یہ انجام کبھی نہ ہوتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر بریڈلو (Bradlow)، اور بیکن (Bacon) بھی قرآن غور سے پڑھتے تو سیکولر نہ ہوتے۔ مگر اس بات کا افسوس کیسے کر سکتے ہیں جو اللہ نے ان کے نصیب میں نہ لکھی ہو۔

یورپ اور امریکہ عقل ومعرفت سے نہیں بلکہ قوت وحشمت کے مظاہرے سے ایسا احساسِ کمتری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی زد میں ہمارے مسلمان باشعور طبقے میں انتہائی غلط تحقیقی رویے جنم لے رہے ہیں۔ اگر ظاہری طاقت، نمائش اسباب ہی حقیقت ہے تو تیرہ سو برس تک مسلمان ہی سچے تھے اور غالب تھے۔ سو برس کی مختصر مدت، اقوامِ عالم میں فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ کونسا ایسا مفکر اور دانشور ہے جو مغرب کے اس غلبہ کو دائمی قرار دے سکتا ہے اور کون سا ایسا مغربی ملک ہے جو اس زوال سے خوف زدہ نہیں جو انہیں

ایک طاقت ور اسلام کے ردِعمل میں نظر آتا ہے۔

لادینی نظام جس سرعت سے اپنے انجام کو بڑھ رہا ہے، وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ کیا زمانے میں ایسے دور نہیں آئے جن میں لادینیت نے متشدد مذہبی معاشروں کو جنم دیا ہو۔ سوائے اس ابتدائی اسلامی معاشرہ کے جو اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کی ابتدا اور انجام اعتدال پر ہے۔ جو اخلاقی آزادیاں، مغربی معاشروں کی اس وقت میراث ہے، ان سے یہی پتا چلتا ہے اگر زمانہ اپنی رفتار پر گامزن رہے تو آئندہ پچاس برسوں میں یہ نظام اس طرح حسرتِ مرگ کا شکار ہو جائیں گے جیسے کوئی پیراسائٹ پلانٹ اپنی اصل سے جدا ہو کر مر جاتا ہے۔

آج سے بہت پہلے جب روما کے عظیم مفکر سسرو نے زوالِ سلطنتِ روما کی پیشین گوئی کی تھی تو حالات ایسے ہی تھے اور آزادی کا عفریت اسی طرح انسانی معاشرہ کی اخلاقی روایات کو نگل رہا تھا۔ وہ پیشین گوئی وقت سے پہلے ہی پوری ہو گئی اور آج جس تیزی سے وقت گذر رہا ہے، کیا بعید کہ آئندہ آنے والے چند سال انسانی حماقتوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں۔ اس لیے اس ضرورت سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا کہ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ ہم کون ہیں، ہماری منزلِ حیات کیا ہے، ہم کتنے آزاد ہیں اور کتنے محکوم۔ دنیا کا انجام تو نظر میں ہے ہی، مگر اس طویل عرصۂ حیات کی کون فکر کرے گا جو خدا کے ہونے سے ہے۔ ذہن کے سنک جانے کی بات نہیں، نہ مذہبی جنوں ہی کی خرافات ہے۔ نہ کسی بے دین ہی کی جرأت رندانہ اور نہ کسی فلسفی اور سائنسدان ہی کے اعداد و شمار کا افسانہ۔ یہ ایک ایسی

حقیقت ہے کہ جس پر قرآن ہا قرآن زندگی کا دارومدار ہے۔ اس نقطہ خیال سے ہٹنے والی عقل غیر معقول اور غیر منطقی ہے۔ انسان اور خدا میں بحث طلب مسئلہ موجودگی کا ہے۔ اللہ محض تسکینِ خیال نہیں یا دوائے دیوانگی نہیں بلکہ کائناتِ بالا کا شہنشاہ، قادرِ مطلق، حالات و اختیارات کا مختارِ کل۔ اس سے گریز صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ نہ ہو اور نہ ہونے کا ایک ہی ثبوت ہو کہ وہ خطا کا مرتکب ہو اور خطا اس کی کتاب اور ذکر سے پرکھی جا سکتی ہے اور قرآن کے بغیر یہ کسی حال میں ممکن نہیں۔

کیا عجیب بات ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ غور کیجئے، انتہائی حیرت انگیز بات ہے کہ جس ذاتِ کبیر کا کوئی اندازہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ موجود نہیں۔ یہ اس کا کلام ہے، اس کے لفظ ہیں، فقرے ہیں، باتیں ہیں، اندازِ گفتگو ہے، طریقِ فکر ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ احکام ہیں، فہمائشیں ہیں، وعدے ہیں، تخلیقی دعاوی ہیں، حقائق ہیں، دنیا و کائنات کی پیدائش کے اذکار ہیں، موت و حیات بعد الممات کے عہد و پیماں ہیں، جنت و دوزخ کا حدود اربعہ ہے، جنس و پیدائش کا تذکرہ ہے، جینز سے افزائش اور بچے کی پیدائش درج ہے، شادی اور طلاق کے قوانین ہیں، خطرات اور وساوس کی کہانیاں ہیں، بھولی بسری ہوئی سچی داستانیں ہیں، مستقبل کے نشانِ منزل ہیں۔ شاید ہی انسانی معیشت، معاشرت اور اندازِ حیات کا کوئی پہلو بچا ہو جس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور اللہ نے اپنے الفاظ میں ہر چیز کا ذکر نہ فرمایا ہو اور اس کے بارے میں ہدایات اور احکام نہ عطا فرمائے ہوں۔ ایک بات ہر شک و شبہ سے بالا ہے کہ اتنے متنوع مسائل پر ایک جیسے انداز، ایک جیسے اعتماد اور اتنے نفیس عمدہ لہجے کی کوئی اور کتاب دنیا میں موجود نہیں جو ہر قسم کے لفظی اور معنوی ابتذال سے پاک ہو۔ وضاحت و بلاغت ایک ہی جملہ میں کارفرما۔ کہیں رحم و کرم کے بادل سایہ فگن،

کہیں عذاب وغضب کی فہمائشیں، کوئی طریقہ ترغیب وتعذیب ایسا نہیں ہے جو آقائے کائنات نے انسانی ذہن کی تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کیا ہو۔ اللہ نہ بھی ہوتا تو قرآن کے مصنف کو اللہ ماننے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا مہربان کہ رسم رحم وکرم کے ترک پر کبھی آمادہ نہ ہو۔ حکمران ایسا کہ کسی بھی شریک کا تصور محال مہربان ایسا کہ تصور بے حال۔ کیا شانِ بے نیازی ہے کہ ہر تعلق سے برأت کا اعلان ہے مگر حسنِ مروت کا یہ عالم کہ سکرات کے لمحے تک بھی انسان کی نجات کا اعلان ہے۔

عجیب وغریب کتاب ہے۔ عرب مغرور ہے، لسّان ہے، دعویٰ زبان میں دوسرے کو عجمی سمجھتا ہے، مگر جب قرآن اس کو دعوتِ مبارزتِ لفظ وبیان دیتا ہے تو ہر تعصب کے باوجود اقرار شکست کر لیتا ہے۔ یہ معجزۂ زبان زبانوں میں صرف قرآن ہی کو نصیب ہوا۔ تمام ادب عالیہ کا ایک سادہ سا اعزاز ہوتا ہے۔ اس کا ہر لفظ اور فقرہ ایسا لکھا جاتا ہے کہ اس سے بہتر کا تصور نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ ہر ادب عالی سے بڑھ کر اس کتاب کی تفسیر اور ہر تاویل کو کبھی بھی یہ درجہ حاصل نہ ہو سکا کہ وہ کتاب کے اصل معانی کے قریب ہو سکے۔ حفاظتِ کتاب کا یہ عالم ہے کہ اگر تاریخِ اسلام میں کسی نے ایک زیر وزبر پر بھی تصرف کیا تو محفوظ ہے۔ اثرِ کتاب کا یہ عالم ہے کہ سادہ قرأت بھی ماہیت قلب بدلنے پر قادر ہے۔ نثر کی کوئی کتاب دنیا میں ایسی نہیں جو اتنے مؤثر اور دلنشیں لہجے میں پڑھی جا سکے۔ ہر قاری حسنِ صوت کے باوجود یہ احساس رکھتا ہے کہ ان آیات کی تلاوت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔

تحریف وتبدل تو دور کی بات ہے، اصواتِ الفاظ بھی اتنے ہی محترم ہیں کہ ہدایت کی جاتی ہے کہ یہاں 'ص'، 'س' پڑھا جائے۔ ایسی حفاظت انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ قرآن کے ٹیکسٹ کی حفاظت اگر ایک طرف اس کے ماننے والے کرتے رہے تو دوسری طرف اس سے مکمل انکار کرنے والے۔ اگر کتاب میں کچھ بھی اختلاف ہوتا تو کمیونسٹ روس کہاں بخشنے والا تھا۔ وہ تو پکار پکار کر اعلان کرتے کہ قرآن مشکوک ہے، تحریف شدہ ہے اور سندِ اعتبار کے قابل نہیں۔ چلئے یہ معجزہ نہ سہی، یہ خدا کا ثبوت نہ سہی۔ مگر سوچنا پڑے گا کہ کم از کم ایک دعوئ قرآن کو پندرہ سو برس کے منکرین جھٹلا نہ سکے۔ ''ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اتنے آنسو تو انسانوں نے جملہ آلام ومصائب پر نہیں بہائے ہوں گے جتنے اس کتاب کی تلاوت کرنے والوں نے اس پر نچھاور کیے۔ اتنی حفاظت سے تو کوئی کتاب ذہنِ انسان میں محفوظ نہیں جتنا قرآن۔ یہ معیارِ یادداشت دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں۔ محبت اور عقیدت کی یہ میراث مسلمانوں نے اس طرح سمیٹی ہے کہ ایک عالم حیران ہے۔ یہی تو قرآن ہے جس کو خدا اپنے دعوئ وجود کے لیے پیش کر رہا ہے۔ نظر نہ آنا موجود کا انکار نہیں۔ ایک عام سی شے بھی انسان کی بصارت سے ماورا ہے۔ ہوا بھی تو نظر نہیں آتی مگر کیا موجود نہیں؟ کیا ایٹم نظر آتا ہے۔ اگر نظر آنے کے لیے آلات کی بہترین صلاحیت درکار ہے تو اللہ پر نظر ڈالنے کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی نظر چاہیے۔ انسان اس معیار تک پہنچنے سے قاصر ہے۔

قرآن اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اللہ کی تعریف وتوصیف، اس کی اہمیت اور اس کی ذات وصفات جیسے اس کتاب نے لوگوں کے اذہان میں مرتب کی ہیں، ویسے دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں۔ خدا کے تصور کی جو آفاقیت اور جو عظمت قرآن میں ہے، کہیں نہیں ہے۔ یہود کا خدا کا تصور ایک قبائلی سردار کا سا ہے جو صرف ایک مخصوص نسل کو اپناتا ہے اور باقی انسانوں کو چاہے وہ کیسے بھی ہوں’ اپنے سایۂ رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ عیسائیت کا تصورِ خدا اس سے بھی کہیں ناقص ہے۔ وہ تو ایک فیملی مین لگتا ہے’ جس کو بڑے ابا کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ موسیٰؑ وعیسیٰؑ نے یہ تصور پیش کیا ہو’ بلکہ جب قرآن میں ہم ان پیغمبروں کا کلام بھی دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ کسی پیغمبر کو بھی اللہ کی حاکمیت’ برتری اور آفاقیت کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا’ مگر تحریف وتبدل اور ان اقوام کی ذہنی بے راہروی نے اس تصور کو اتنا محدود کر دیا کہ عمرانیات کے ماہرین کو خدا ہر قوم کی ذاتی اور محدود مفادات کی پیداوار لگا۔ قرآن میں اللہ کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ذات وصفات کا خود احاطہ کرے تا کہ لوگ اس کا خود حق ادا کریں اور اس کی عظمت اور عزت کو کسی شے سے مثال نہ دیں اور جوں جوں زندگی اور تہذیب آگے بڑھی’ علم وحکمت کی افزائش ہوئی۔ نئے آفاقِ علم وتحقیق کشادہ ہوئے۔ ہمیں اللہ کا بہت جائزہ ملا۔ علم ہی سے اس کی شناخت ممکن تھی۔ اس لیے قرآن میں اللہ نے فرمایا:

> ”عالم ہی اسے بہتر جاننے والے ہیں اور یہی اللہ کے لبادۂ علم میں لپٹے ہیں“۔

قرآن علم ہے اور علم قرآن۔ قرآن نہ صرف غور وفکر کی دعوت دیتا ہے بلکہ وہ تمام موضوعات بھی متعین کرتا ہے جو انسان کو بہترین نتائج تک پہنچا سکتے ہیں۔ نقطۂ نظر یہ ہے

کہ جس زندگی کو آپ مستقل قدر قرار دے رہے ہو، یہ عارضی ہے۔ زمین اور کائنات کا تناظر یہ ہے کہ اس کا شمار راہگذر کے ایک ذرہ کی طرح ہے۔ یہ اندازہ حقائق پر مبنی ہے۔ نسلِ انسان کی افزائش تسلسل سے آگے بڑھی ہے، مگر یہ افزائش صرف وہ تعداد پوری کرنے کے لیے ہے، جس کو اس زمین پر آبادی کے لیے چنا گیا ہے۔ یہ طریقۂ کار ابدتا آخر جاری نہیں رہ سکتا۔ بہت سے ایسے مفروضے جنہیں انسان اپنے لیے مستقلاً قائم و دائم قرار دے دیتا ہے، خدا کے نزدیک غیر صحت مند اور نادرست ہیں۔

انسان یہاں قائم رہنے کے لیے نہیں۔ نسل انسان دائمی نہیں ہے۔ زمین مستقل بستی نہیں۔ ذرائع زمین ہمیشگی کے حامل نہیں۔ آب و ہوا کسی وقت بھی متغیر ہو سکتی ہے۔ زمین غیر معمولی حالات میں غیر معمولی حالات کی پیداوار ہے۔ اس جیسی زندگی کا فی الحال کسی اور سیارے پر گمان نہیں۔ جدید سائنس کے بھی اگر نظریات دیکھے جائیں تو یہ اس جائزہ سے دور نہیں۔ پھر یہ کتنی غیر معقول اور غیر عقلی آرزو ہوگی کہ ہم اسے دائمی قیام اور آبادی کا حامل سمجھیں۔ اگر کسی اور سیارے پر انتقالِ آدمی ممکن بھی ہوا تو آئندہ کئی صدیوں میں صرف چند سو افراد ہی اس زمین سے باہر جاسکیں گے۔ پھر دوسرے سیارے کے حالات اس سے زیادہ نامساعد ہو سکتے ہیں۔ فی الحال کائناتی بستیاں افسانوں اور دیوانگی کے خواب لگتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر خواب پورا ہو۔ خاص طور پر جب کہ قرآن کا مصنف اسے اپنی کائنات، اپنا جہان اور اپنی دنیا قرار دے رہا ہو تو کوئی بھی صاحبِ علم و دانش اس حقیقت سے گریز نہیں کرسکتا، اس لیے قرآن کے مختلف اندازہائے تعلیم کے مابین اللہ صرف علم کو معیارِ آگہی قرار دیتا ہے۔ اللہ کے مطابق اہلِ علم و عرفان ضرور اس حقیقت کو جان لیں گے

جو وہ بیان کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک 'ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے'۔ سب سے اوپر وہی علم والا ہے' جو قرآن کا فہم رکھتا ہے۔ جسے علیؓ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ پڑھے تو ہم بھی وہی قرآن ہیں جو تم پڑھتے ہو مگر یہ کہ ہمیں فہمِ فراواں بخشا گیا ہے۔

قرآن کہیں فقال نظر نہیں آتا' بلکہ واضح طور پر قرآن کا لہجہ مضبوط، مستحکم اور حتمی ہے۔ اگر بطلیموس یہ کہہ رہا ہے کہ زمین ساکت ہے تو قرآن بڑی وضاحت سے بتا رہا ہے کہ تمام کائنات چل رہی ہے اور تمام سیارگان اپنے اپنے افلاک میں تیر رہے ہیں۔ اگر تخلیقِ کائنات کے بارے میں دیومالائی تصورات رائج الوقت ہیں تو قرآن بڑی وضاحت سے کہتا ہے کہ آفرینشِ کائنات میں صرف ایک وجود مادہ تھا جسے پھاڑ کر بکھیر دیا گیا ہے اور یہ کہ تمام زمین پر حیات صرف پانی سے پیدا کی گئی ہے اور آئن سٹائن سے بہت پہلے قرآن نے فرمایا کہ کائنات وسیع تر ہو رہی ہے۔

قد و قامت اور جسامت کا مسئلہ ضرور رہا۔ پہلے یا آج سورج کی عظمت دیوتاؤں جیسی رہی۔ عظیم جلتا ہوا سیارہ جو زندگی اور نور کا منبع ہے، ہر دور میں پرستش کے قابل سمجھا جاتا رہا۔ اس کی عظمت میں نہ پہلے کوئی فرق تھا' نہ آج ہے۔ مگر قرآن کے نزدیک یہ محض ایک چراغ ہے اور ایسے اَن گنت چراغوں سے اُس نے کائنات سجا رکھی ہے' جسے آپ بہت سے ستاروں کا ٹکراؤ کہتے ہیں۔ جس کے اثرات کو جاننے کے لیے آج کے دور میں بھی آپ کے آلات کم تر ہیں۔ اللہ اسے صرف ایک پتھر قرار دیتا ہے۔ زبان اگرچہ اس دور کی ہے مگر اطلاعات آج کی ہیں۔ بلکہ انجامِ حیات و کائنات تک کی ہیں۔ تشکیک کی سیاہ چادر میں

سوال ستاروں کی طرح ٹکے ہوئے ہیں اور جوابات محال۔ دورِ حاضر کا انسان بھی پانچ سالہ، دس سالہ یا پچاس سالہ پلاننگ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ قرآن کا پلانر دنیا کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل ماسٹر پلان (لوحِ محفوظ) بنا کر اسے جاری ہونے کا حکم دے کر فارغ ہو چکا ہے۔ کیا عجیب کہ جو اللہ ابتدائے حیات و کائنات جانتا ہے اور جو انتہائے حیات و کائنات لکھ چکا ہے اُس نے آج کے انسان کی ذہانت اور فطانت کو ہیچ میں شمار نہ کیا ہو۔ اسے اپنی تخلیقات کا اندازہ نہ ہو۔ اسے اسبابِ معیشت اور معاشرت میں تبدیلیوں کی خبر نہ ہو۔

قرآن کے مطابق انسان ایک عجلت پسند، سادہ لوح مخلوق ہے جو اپنے تکبراتِ عالمیہ سمیٹ نہیں سکتی۔ انسان ایسا کمزور ہے جو طاقت کے تصور کو سنبھال نہیں سکا۔ ایسا کمزور کہ آج تک اپنی جبلتوں کو اپنی عقل کے تابع نہیں کر سکا۔ عبقریت اور نابغہ ہونے کا دعویدار سادہ حقائق کو نظر انداز کر گیا۔ صراطِ مستقیم کی راہِ بلند چھوڑ کر پستیوں اور گہرائیوں میں کھو چکا ہے۔ کیا یہی معیارِ عقل ہے کہ زندگی اور موت کے واحد بڑے سوال کو نظر انداز کر دیا جائے اور روٹھے ہوئے بچوں کی طرح نہ ماننے کی رٹ لگائی جائے۔ شاہانِ مشرق و مغرب غرور و تکبر سے خدائی کے اعلان فرمائیں۔ اس انسان کو کون آدم کہے گا۔ رجعت آدمیت نظر آ رہی ہے۔ جبلی دور کا ہوموجبلس (Homo-habilis) اور ہوموایرکٹس (Homo-erectus) نمایاں ہے۔ فراعنہ مصر پھر کسی حادثۂ نیل کے انتظار میں ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے فکری دجال، چنگیز و ہلاکو کی بوسیدہ ہڈیوں سے سبق سیکھنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ خدائے قہر و جبروت شاید نشان لگا کے بیٹھا ہے اُس راہ پر جس پر انسان کا تمرد اور احمق معاشرہ گامزن ہے۔ تنافر اور حسد کی آگ، قتل و غارت، ہلاکت و بربادی انسان کا نصیب ہو چکی ہے۔ ایک قدم اور یہ

دنیا بھی اس نوزائیدہ ستارے کی طرح ہوجائے گی جس پر صرف گندھک اور سیال لوہے کی نہریں چلیں گی ۔ جہاں پینے کو گلا کاٹتا ہوا زہریلا مواد ہوگا، جہاں ویرانیوں کی آغوش میں تھوہر اور کیکٹس اُگیں گے۔ میل ہا میل کی کھائیاں اور گہرائیاں اور بھڑکتے ہوئے الاؤ۔ مگر پھر موت نہیں ہوگی ۔ لباسِ اذیت بدلے جائیں گے اور احساسِ اذیت مستقل رہے گا۔

ابھی شاید سکرات سے پہلے کچھ لمحے باقی ہیں ۔ کیا اب اہلِ عقل وخرد کو قرآن کی ضرورت نہیں ۔ کچھ غور کرنے کا وقت باقی ہے ۔ جزدانوں میں لپٹے ہوئے اللہ کے ڈیٹا پر نظر ڈالنے کے لیے تھوڑا سا وقت باقی ہے ۔ غور وفکر میں انکار نہیں ہوتا ۔ حرکت اور شناخت ہوتی ہے ۔ انسان مرنے سے پہلے کب آسودہ ہوتا ہے مگر یہ کہ اسے یقین ہو کہ جو اس نے سوچا، ایمان اور سچائی سے سوچا۔ قرآن سے پہلے کے علوم پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک تضادِ علم وحکمت صدیوں تک انسان کا نصیب رہا۔ ایک طرف تو وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ آج تک دنیا اس وقت کے دانشوروں اور حکماء کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے ۔ بلوغتِ فکر جو یونان اور روما اور مصر کے دانشوروں میں تھی اور جو تحصیلِ علم کا جذبہ اس وقت نظر آتا ہے اور جو نقوش مستقل انہوں نے چھوڑے ہیں، آج بھی مشعلِ راہ گذراں ہیں ۔ کون ہے جو سقراط سے اپنے آپ کو بہتر سمجھے اور کون ہے جو افلاطون اور ارسطو کی گرہ کشا ذہانت کا قائل نہ ہو۔ اگر ایک طرف زینو اور دیوجانس جیسے صاحبِ نظر موجود ہیں تو دوسری طرف عقل وفکر کی باریکیوں کے ماہرین جو سوال در سوال معقولات اور منقولات کو نارسا بلندیوں تک پہنچا رہے ہیں ۔ اس زمانے میں کئی نئے علوم کا اجراء ہوا۔ حساب، جیومیٹری، فلسفہ، حکمت، حتیٰ کہ عمرانیات کے ابتدائی سراغ بھی ان صاحبانِ فکر سے ملتے ہیں ۔ روما کے

پلوٹارک اور سسرو آج کے رسل اور وائٹ ہیڈ لگتے ہیں۔ آنے والوں نے ان کی رہنمائی سے علم کی شناسائی حاصل کی اور قافلہ فکر کو اگلی منزلوں تک پہنچایا۔ بطلیموس (Ptolemy) کا جدول شمسی چاہے ناقص سہی مگر ایک نئے علم کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ آغاز کرنے والا بہرحال بڑا ذہین ہوتا ہے۔ (Dionysius) ایروپے جائٹ اور پلاٹینس جیسے نابغہ بھی موجود ہیں۔ آگسٹین اور ایکویناس جیسے مذہبی فلسفی بھی۔ ہندوستان میں ٹیکسلا اور اجین کی درسگاہیں علماء اور فضلا سے معمور نظر آتی ہیں۔ ایک طرف ادب عالیہ کا مصنف کالی داس، چندر بھان بھاٹ اور دوسری طرف فلسفہ حکومت و تاریخ کا بانی، عہدِ قدیم کا میکیاولی پنڈت چانکیہ۔ مہارشی اور مہا بھکشو کلچر کی اساس صرف تزکیۂ ذات ہی پر نہیں بلکہ ماورائی علوم کی تحصیل اور مکمل فلسفہء زندگی تک رسائی بھی ہے۔ وید، اُپنشد، شاسترا، رامائن، مہابھارت جہاں تاریخ اذکار سے بھرے ہیں، وہاں اعلیٰ ترین ادبی، علمی اور فلسفہٗ افکار کے بھی حامل ہیں۔ چین کا نرالا حال ہے۔ وہاں فلاسفر اور معلم ایک ہیں۔ کنفیوشس اور تاؤ کی باتیں پڑھ سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی ذہن بالغ نہیں بلکہ آج کا مشینوں کی طرح اگتا ہوا یہ سیلاب انسانیت ان کے مقابل حقیر اور منفعل نظر آتا ہے۔ گنتی کے آلات، پہیہ، منجنیق اور جہاز مشینی آلات میں نمایاں ہیں۔ آئرن فلٹر، زرہ بکتر، گھڑی اور قلم موجود ہیں۔ پریس ہے، بارود ہے۔ لوگ کیمیائی زہر سے آگاہ ہیں۔ اہلِ سبا کا بند مآرب بھی قرآن سے قبل کی انجینئرنگ ہے اور پھر اہرامِ مصر تو آج تک مصریوں کی ہندسیائی مہارت اور تعمیری صلاحیت کا علم بلند کیے ہیں۔ کاریگری اور حکمت بلندیوں پر ہے۔ سائنس کا پہلو کچھ کمزور ضرور نظر آتا ہے، مگر پھر شاید آنے والے انسان کے مقدر میں بھی تخریب و تعمیر کا کچھ حصہ تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ قرآن خلائے علم و فکر میں نمودار نہیں ہوا۔ ذہن اُس وقت بھی اتنا ہی بالغ تھا جتنا آج ہے۔ نظام ہائے سلطنت جمہوری بھی ہیں اور آمرانہ بھی۔ ماہیت اور نوعیت بدل گئی ہے اور شاید آبادی کے مطابق آلات شکست و ریخت کی استعداد بھی۔ مگر قرآن سے پہلے کا دور قطعاً فکرِ انسان کا نابالغانہ دور نہیں۔ کیا بعید ہے کہ یہ سوال اٹھے کہ قرآن اپنے دور کی تعلیمات سے کیسے ناواقف رہ سکتا ہے اور یہ کہ قرآن آنے والے وقتوں کی تشکیک اور ترقیٔ علم و حکمت سے کیسے دامن چرا سکتا ہے۔ پندرہ سو برس پہلے اور بعد اور عصرِ وسطیٰ میں کتاب حکیم۔ کیا قرآن اپنے یا قدیم اثر سے معلومات مستعار لیتا ہے۔ معاشرہ تو یقیناً وہی ہے جو پچھلی صدیوں کے توسط سے اسے میراث میں ملا ہے، مگر علم و حکمت اور نظامِ زندگی بھی اس کے پیشِ نظر ہو سکتے ہیں۔ کیا قرآن پر سرقہ فی العلوم کا الزام لگ سکتا ہے؟ کیا یونانیوں اور رومیوں کی طرح وہ بھی فطرتِ اشیاء کے بارے میں گومگو کا شکار ہے؟ کیا وہ بھی مفروضوں پر بنیادی مسائل کی گفتگو کرتا ہے کہ وہ بھی ظن و تخمین سے مقاصدِ حیات کا تعین کرتا ہے؟ کیا اس کا پیغمبر بھی ارسطو اور افلاطون کی طرح ایسا سوفسطائی ہے جو اپنی عقل و حکمت سے تجسس و فکر کو ہوا دے رہا ہے؟

یہ انسان تحت الثریٰ تک پہنچ چکا ہے۔ غرور و تمکنت، شان و شوکت، قوت و اقتدار، حکومت و طاقت کے معیار انصاف کی بجائے استحصال پر مبنی ہیں۔ بنی آدم اپنے ہی ہم نسلوں کو انسانیت کا رتبہ دینے سے گریزاں ہے۔ انسانیت درجات میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ذہنی منافرت اتنی بڑھ چکی ہے کہ مذہبی اور سماجی روایات بھی برداشت نہیں کی جا رہیں۔ سیاست بھیڑیئے کے غذرلنگ کی طرح ہے جو کمزور کو ہر حال میں اپنی خوراک بنانا چاہتا

ہے۔ ردِعمل خوفناک ہے اور پہلی دفعہ دنیا میں 'تشدد' ایک فلسفۂ خیال کی طرح ابھرا ہے۔ اذیت پسندی ظالم ومظلوم کا شعار بن چکی ہے۔ قتل وغارت گری چیلنج اور جوابِ چیلنج ہے۔ اگر ظالم کے پاس افرادی اور اسلحی برتری ہے تو مظلوم کے پاس اس کا غیض وغضب، ذاتی فنا، حملے کے مقام اور وقت کا چناؤ ہے۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے کوئی امکان نہیں۔ ''دہشت گردی'' ایک ایسا خوف ہے جس کو کوئی متمدن معاشرہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ امن وسکون کس کام کا جس پر ہر وقت انجانے حادثوں کی تلوار لٹک رہی ہو۔ سیاست دان کمتر اذہان کے مالک ہیں اور دنیا میں کوئی بھی ایسا صاحبِ تدبر نظر نہیں آتا جو رہِ اوسط کی تلقین کر سکے یا تیزی سے پہنچتے ہوئے انجام کے سامنے دیوار کھڑی کر سکے۔ انتہائی نازک موڑ پر انسانی قافلہ کے سالار ایسے متکبرین ہیں جنہیں سیاہ وسفید میں کوئی تفریق نہیں لگتی ہے۔ یہ بیمار ذہن نسلِ انسان کی بقا کے لیے کوئی بھی تحفظ تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا ادارہ مضحکہ خیز حد تک غیر فعال ہو چکا ہے۔ اپنے بنیادی مقصد کے حصول میں اقوامِ عالم کی بےبسی نمایاں ہے۔ امیر اقوام کا دستِ نگر یہ ادارہ ایسے لوگوں کی قیادت میں چل رہا ہے جو کسی بھی مؤثر انسانی کردار سے عاری ہیں۔

طاقتور اقوام کے کارندے بظاہر ایک آدھ قرارداد سے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر وہ بھی منافقانہ تسلی لگتی ہے، جو دوسری کمزور اقوام کو تلقینِ صبر اور قبولیتِ جبر کے لیے ہوتی ہے۔ بڑی اقوام انسانی برابری کی قائل نہیں رہیں۔ طاقت کے بل بوتے پر وہ دنیا میں ایسی تقسیم پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ہندومت کے پروہتوں نے ہزاروں برس پہلے تخلیق کی۔ اب پوری دنیا شودر، ویش، کھتری اور برہمن میں تقسیم ہو رہی

ہے۔ غیر ترقی یافتہ قوموں کو یہ حق حاصل نہیں کہ ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ دنیا کے برابر شہریت حاصل کرسکیں۔ ہاں یہ کہ وہ ان کے رحم اور کرم گستری سے اپنی زندگی' رزق اور افزائش تک محدود کرلیں۔ مہذب اقوام دہشت گردی کے عنوان سے اپنے موثر اسلحہ کی نمائش کررہی ہیں' مگر دہشت پسندوں کے بے دریغ اور خوفناک ردِعمل نے ان کے مستقبل کے خواب وخیال مشکوک کردیئے ہیں۔ شیشے کے گھر پر نائن الیون کے ایک پتھر نے اعصاب شکن حالات پیدا کردیئے۔

حادثہ عمرانیات یہ ہے کہ لالچ، حسد، خوف، نقالی اور بندر بانٹ کی وجہ سے Homo-Sapian دوبارہ Chimpanzee کا Status حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہ رجعتِ ذہن اخلاقی معاملات میں پست ترین گہرائی چھورہی ہے۔ انسانی آزادی کے نام پر امرد پرستی' لزبین (Lesbian) ازم کی سرپرستی، ازدواجی ذمہ داریوں سے گریز، بے نام و نشاں بچوں کی افواج ایک ایسی نسل تخلیق کررہی ہیں جن کا کوئی تعلق اور رابطہ معاشرے سے نہیں ہے۔ ہر فرد اپنے آپ کو ایسی انفرادیت کا زہر پلانے کی کوشش کررہا ہے جس سے تمام انسانی معاشرہ گلے سڑے ہوئے وجود میں بدل جائے گا۔ اگر اس مبتذل اخلاقی بحران کی یہی رفتار رہی تو اگلا قدم شاید مرد و عورت کے ایک دوسرے کے مقابل آنے کا ہے' جو ایک دوسرے سے بے نیاز ایک ایسے تصادم کا شکار ہوجائیں گے جس کے بعد شاید مرد ایک ایسی Species کی طرح محفوظ کیے جائیں گے جہاں وہ عورت کی افزائش نسل میں کام آسکے۔ شہد کی ملکہ مکھی کی طرح کام ختم کرنے کے بعد اس مرد کا نصیب صرف موت ہوتا ہے۔

اگر اللہ نہ ہوتو اس نظام میں مداخلت کا امکان بہت کم ہے مگر اللہ اس انجام کو لکھ چکا ہے۔ وقت مقرر ہے، مقدر کا کلاک کاؤنٹ ڈاؤن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حساس ذہن اس کی کلک سن سکتے ہیں۔ اس صدا کو سننے کے لیے کوئی خصوصی حس ادراک (ESP) نہیں چاہیے، نہ کوئی مراقباتی کوشش، نہ یوگا کی مشقیں ہی۔ اس کے لیے تو آپ کو کتاب حکیم قرآن کا مطالعہ کافی ہے۔ اور اگر پھر بھی وضاحت درکار ہوتو حدیثِ رسولِ اکرم ﷺ بہت ہے۔ لمحۂ زوال کی تمام علامات درج ہیں اور ننانوے فیصد پوری ہو چکی ہیں۔ یقیناً امید قائم ہے، مگر کسی دنیاوی حکمران سے نہیں بلکہ اس قادر مطلق سے جس نے رحم کو اپنا شعار بنایا۔ رحمت کو اپنی صفات پر غالب کیا اور نسلِ انسان کی بقاء کا اپنے نظام ہی میں وقت و زمانہ میں گنجائش رکھی۔ مگر اے حضرتِ انسان! اے مسلمان! تیرا قرآن کدھر ہے؟

قرآن ہی اصولِ علم کا تعین کرتا ہے۔ اللہ کا کلام علم و حکمت کی اعلیٰ ترین اساس ہے۔ ماننے یا جاننے کا مسئلہ نہیں مگر جو شخص بھی قرآن تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے اتنا تو پتہ ہونا چاہیے کہ میں کس ڈیٹا کو جانچ پرکھ رہا ہوں۔ یہ کسی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ادیب اور فلسفی کا نکتۂ نظر نہیں۔ یہ معاملات کو سلجھانے کا بلکہ معاملات اور کیفیات کے پیدا کرنے والے کا علم ہے۔ کسی ایسے سنکی ذہنیت کا نہیں جو اپنی محرومیوں اور زندگی کے مسائل سے کسی مخصوص فکر اور طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی انٹلیکچوئل کو اللہ کے انصاف پر اعتراض ہو، کسی کو اس کی حسِ جمالیات اپنے جیسی نہ لگتی ہو، کسی کو اس کا ضابطۂ اخلاق متشددانہ لگے۔ کوئی اس کے احکام میں نقصِ احترامِ انسان نکالے۔ کوئی غلام پر نکتہ چیں اور کوئی احکام نکاح پر حرف زن ہو، مگر انہیں شاید صبر نہیں ہے اور صبر کا اصول تو اللہ نے دیا

ہے۔ ''تمہیں صبر آئے بھی کیسے کہ تجھے علم نہیں ہے''۔

ایک بہت بڑا فاصلہ جو ناقدین اور کتاب میں ہے، وہ زمانی اور مکانی ہے۔ کوئی انسان اپنے وقت اور حدِ مکاں سے آزاد نہیں۔ ایک سو برس کی زندگی بسر کرنے والے کے پاس صدیوں کا عرفان نہیں ہے۔ وہ زمین و آسمان اور مخلوقات کا خالق نہیں۔ کوئی بھی دانشور اپنے واقعات و حالات کو اپنے عصر کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ وہ اسے سارے زمان اور مکاں کے مالک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کم نظری ہمیشہ ذہانتوں کے فاصلے کا سبب بنتی ہے۔ پھر جس کو اپنی ذہانت کا نشہ ہی سرمست کر دے، جو اپنی شخصیت کے احساس کم تر و بہتر کو حل نہ کر سکے۔ اسے قرآن کیسے مناسب لگے گا۔ اگر غلامی و آزادی، اللہ کے انعام و ثواب، جزا و سزا کا حصہ ہو تو وہ نسل انسان سے کیسے منتقل ہو سکتی ہے۔ اگر آپ آج غلامی ختم کرنے کے داعی ہیں تو اللہ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ کی اچھی سوچ اللہ کے ہر کرم کا نتیجہ ہے مگر اللہ ہر دانشور کی ذاتی سوچوں کو تحفظ نہیں دیتا۔ دانشور تو انسانی آبادی کا کوئی فیصد نہیں بنتا۔ پھر کیا خدا جملہ انسانوں کی ہدایات کو ان ہوا و خیال کے لوگوں کے سپرد کر دے۔ اگر اللہ نے شادیوں کے باب میں مردوں اور عورتوں میں تفاوت رکھ دیے تو چند زبان دراز عورتوں کے سوا کس کو اس کی مخالفت کا خیال آتا ہے۔ یہ چند متمدن، دانشور عورتیں اور کام کرنے والی عورتیں تین ارب میں کتنا تناسب رکھتی ہیں۔ اور کیا قرآن صرف ان کے لیے اترا ہے کہ جملہ زمانوں میں جملہ خواتین کے لیے جن کے پچھلے اور اگلے مسائل تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ قرآن میں ایک اور اصول بھی مرتب کرتا ہے۔ ''تم کسی شے کو نہیں چاہتے اور اس میں تمہارے لیے خیر ہے، اور تم کسی شے کو چاہتے ہو اور اس میں تمہارے لیے شر ہے۔

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔ کیا اس بات سے انکار ہوگا کہ کوئی اللہ ہے۔ وہ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ اور تمام جبر وقدر کی تفسیر کے لیے کیا یہ آیت کافی نہیں۔ بظاہر ناگوار اور بظاہر خوشگوار دونوں کیفیات اس وقت تک معانی کی حامل نہیں ہوسکتیں جب تک معینہ وقت نہ گذر جائے۔

کیا انسان فیصلہ کر چکا ہے کہ کون سوچتا ہے۔ کیا سائنسز اس نتیجے پر پہنچ چکی ہیں کہ خیال ہمارے ہیں یا اجنبی دنیا کے مسافر جو ہمارے ذہن میں ملائکہ اور شیاطین کی طرح وارد ہوتے ہیں اور کچھ کیفیات کے چناؤ کا سبب بن جاتے ہیں۔ کیا دل کے کارڈیوگرف کی طرح ذہن میں بھی دہلیزیں ایسی تو نہیں ہیں کہ جن پر خیال وفکر کا نزول ہوتا ہے اور انسان کے پاس صرف صلاحیتِ فہم ہے اور وہ ان کیفیات واشارات کو لفظ وبیان دے کر چناؤ کے عمل تک لے جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آنے والا وقت انسان کی اس بے بسی کی دلالت بھی کرے گا جو اللہ نے سادہ لفظوں میں قرآن میں بیان فرمائی۔ ''تم چاہ بھی نہیں سکتے اگر اللہ نہ چاہے''۔

ذہن کی دنیا ابھی شناخت کی محتاج ہے۔ اس کی وسعت تو اس کے باہمی نکاتِ اتصال سے ہے۔ ظاہر ہے اس کائناتِ اصغر کی تحقیق ابھی اتنی ہی کم ہے جتنی کائنات اکبر کی جستجو۔ مگر کیا اس بات کا امکان ہے کہ ہم انسان اتنے طویل پروجیکٹ کی پلاننگ کر سکیں۔ کیا ہمارے پاس وقت ہے۔ کیا کسی اور تہذیبِ انسان کے پاس بھی اتنا وقت تھا کہ وہ اپنی سائنسی، ادبی اور معیشتی پلاننگ پوری کر سکتی۔ اس بار انسان زیادہ خوش فہم نظر آتا ہے۔ اس کے آلات نفیس تر اور ذہانت باریک تر ہے۔ مگر کیا وہ اسباب جنھوں نے پہلی تہذیبوں کو

برباد کیا' اب موجود نہیں ۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کا مہذب انسان پہلی قوموں کے اخلاقی معیار سے زیادہ پست اور تخریبی قوتوں کو زیادہ ہوا دینے والا ہے ۔ اگر ایک طرف وہ سائنسی اور معروضی تحقیق میں پچھلی اقوام سے کہیں برتر ہے تو اخلاقی، سماجی اور معاشرتی حالات میں وہ ایک ایسی نہج اختیار کئے ہوئے ہے جو کسی وقت بھی ہمیں حادثے سے دوچار کر سکتی ہے ۔ انصاف، اخلاق، کردار، سیرت، ترحم اور باہمی اشتراک کے لحاظ سے ۔

فہم قرآن میں بڑا مسئلہ کمی علم و معلومات ہے۔ ایک طرف قرآن کا عظیم مصنف تمام کائناتی اور بالائے کائنات تخلیقات کا تذکرہ کررہا ہوتا ہے اور دوسری طرف قاری خواہ کتنا ہی ذکی اور فہیم کیوں نہ ہو، عقل و دانش کی بے بسی محسوس کرتا ہے۔ ہمارے تمام علوم کا انحصار اس تحصیل پر ہے، جو ہم عمرِ مختصر کے کسی حصے میں بڑی عرق ریزی سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی جملہ علوم کی ایک شاخ یا ایک شعبہ ہی ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں تو علم اور بھی سکڑ گیا ہے اور سپیشلائزیشن نے رہی سہی قدرِ علم معدوم کردی ہے۔ تحصیلِ علم کا فائدہ تو صرف ایک صورت میں ہے کہ تمام انسان اپنے حصے کی محنت اور عرق ریزی جملہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں، مگر محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحصیلِ علم بھی اب ترقی پذیر ملکوں کے ہاتھ میں احساس برتری کا حصہ بن چکی ہے اور کمزور قوموں کو ان علوم کی تحصیل ممنوع قرار دے دی گئی ہے، جو انہیں کبھی ترقی یافتہ ملکوں کے مقابل لاسکیں۔ اگرچہ کچھ شعبوں میں تحقیق و جستجو میں جملہ ممالک شراکت دار ہیں مگر انسان کے اعلیٰ شرف اور جستجوئے کائنات میں اور نفیس تر آلات و تعلیمات میں بیشتر ذہین انسان داخلے کے اہل نہیں۔۔۔۔۔

اہل مغرب قرآن کو کیوں اس اہمیت کے ساتھ نہیں دیکھتے جس سے ہم متاثر ہیں۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ خدا کی تلاش، اس کو شریکِ ذات و کائنات کرنا اس کی قدرت و حکومت کا اعتراف انسان کی ترجیح نہیں ہے۔ وہ انتہائی اہم فیصلے سے گریزاں ہیں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کر رہے کہ وہ زمین میں ایک بسائی گئی بستی ہیں۔ چلیے ایک حد تک یہ صحیح سہی، مگر المیہ یہ ہے کہ عقل و دانش کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سوال کو سنجیدگی سے قابلِ غور سمجھتا ہو۔ بسا اوقات تو یہ صرف مضحکہ اور تفنن کا باعث ہوتا ہے۔ مذہب کو ماننے والوں کے حالات سے دیکھا جا رہا ہے۔ جیسے یہودیت اور عیسائیت اپنے پیغام کے مطابق افراد پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اُسی طرح اسلام بھی ان صاحب فکر و کردار لوگوں سے تہی ہے جو اسلام کی اعلیٰ فکری اقدار کے حامل ہوں اور خدائے واحد کی بندگی کی علامت سے مختص ہوں۔ فرد اور معاشرہ مذاہب اور خاص طور پر اسلام کی اقدار کے معیار تک پہنچ سے دور ہے۔ پستیِ فکر، جہالت اور ملاّ کی کساد بازاری نے اسلام کو ذہنی اور فکری ترجیح کی بجائے ایک عملی ورزش بنا دیا ہے۔ اسلام میں غیر اقوام کی خفیہ تنظیمات کے اندر آ گئے ہیں۔ عام مکاتب نہ صرف تعلیم کو ذاتی وجاہت اور گروہی تعصبات کے لیے استعمال کر رہے ہیں بلکہ ایسے محدود، متعصب نظامِ تربیت وضع کر رہے ہیں جو مخلص مسلمانوں کے کردار کو محدود کر کے انہیں خوف و دہشت کی علامت بنا رہے ہیں۔

قرآن اس قسم کی کسی بھی بے اعتدالی کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ وہ خدا کے لیے قتل کرنے میں بھی بہت محتاط ہے۔ اجازتِ جہاد بھی اعتدال اور احترامِ انسان پر مبنی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی بھی ملاوٹ اور استعمال کے سخت مخالف ہے۔ اسلام نہ جدید

ہے نہ قدیم، نہ رجعت پسندی کا حامل، نہ ترقی پسندی کا۔ اسلام کی بنیاد قرآن ہے اور قرآن ہر زمانے کا کلاسیک ہے۔ ترقی اشیاء اور اسباب میں ضرور موجود ہے مگر انسان اور اُس کی فطرت میں نہیں۔ آج کا انسان پہلے انسان سے اخلاقی اقدار میں نہ مختلف ہے، نہ نیا۔ ہر عہد میں ہر انسان نیا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اتنا ہی پرانا جتنا عہد اساطیر میں تھا۔ علم کا رخ تربیتِ نفس کی طرف نہیں رہا۔ تصرفِ اشیاء کے باوجود عادات وخصائل کی اصلاح کا معیار قائم نہ ہو سکا۔ ایسی درسگاہیں (صوفیا کے علاوہ) بھی قائم نہ ہوئیں جو انسان کی ترکیبِ نفس بدل سکتیں۔ ترغیبات وتحریصات میں کوئی سائنس تصرف نہیں کر سکی۔ بخلِ ذات کا علاج کوئی نہ نکلا۔ وجاہت طلبی اور حرص حد وحساب سے نکل گئی۔ خود شناسی کا تصور ختم ہو گیا اور خود غرضانہ رویے ہوا پا گئے۔ جنت کے داخلے کے معیار کم سے کم تر کر دیئے گئے۔ مگر آرزومند ناپید۔ جہنم کی ہر کلاس (Over- crowded) میں رش قابلِ رشک۔ حدیث کے الفاظ میں دو خیمے رہ گئے۔ ”کفر اور ایمان کے“ نفاق کفر کا آلۂ کار ہے۔ اب تو رونمائی کے لیے بھی اسلام کا نام نہیں لیا جاتا۔

اللہ کے بندے ناپید، ملائیت کے چوزے بے شمار۔ حضورِ یزداں سربسجود، صاحبانِ اخلاص مفقود، سر پٹختے ہوئے، ریش دراز، سر بریدہ حرص وآز کے پرستاراں گنت۔ قرآن خوانی مجالس مرگ کی رونق اور قرآن فہمی اسیرِ مکرِ نفس خراب کار۔ مولویوں کا ہجوم مثل مشروم اور عالم الٰہیات سے اہلِ جہاں محروم۔ عالمِ اسلام طلسم ہوشربا ہے کہ ساحرانِ مغرب کے مسحور اذہان نئے نئے علوم وفنون کے پتلے تیار کر رہے ہیں۔ جدت واختراع کے نام پر سامریٔ عہد حاضر نے نئے حصار تعمیر کر لیے ہیں۔ ایک بھی طلسم کشا نہیں۔ لوحِ طلسم

کائنات تو قرآن ہے۔ ایک ہی کتاب ہے جس کے بعد کوئی سوال نہیں رہتا۔ قرآن کے بغیر آپ کا کوئی نظریہ، کوئی خیال، کوئی حل اس قابل نہیں کہ جملہ موجودات کی نظریاتی وضاحت کر سکے۔ سائنس اور فلسفہ کی ہر رہگذر اندھی دیواروں تک رک جاتی ہے۔ بقول ربّ کریم یہ قافلۂ نفاقِ علم بے شمار تاویلات اور توضیحات کے باوجود تاریک سمندروں میں بلاخیز امواج میں ایک ناپائدار سفینے کے مسافر ہیں جو برستے ہوئے بادل اور چمکتی ہوئی بجلیوں میں ٹوٹی پتوار لیے سفر کر رہے ہیں۔ لمحہ بھر کی چمک انہیں گرد و پیش کی کچھ جھلک دکھا تو دیتی ہے مگر اگلے ہی لمحے انہیں ظلمات کی گہرائیاں پھر سمیٹ لیتی ہیں۔

کوئی نظریہ کامل نہیں اور وضاحت کلی کا حامل نہیں، مگر یہ کہ قرآن کے اللہ کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کیا جائے۔ موجودات کے رخ وجودِ مطلق کی طرف موڑے جائیں۔ زیر و زبر، کم و بیش، ماضی و حال و مستقبل، فکر و خیال، جہالت و علمیت، زمین و آسمان، ذات و کائنات، خوف و اضمحلال، خوف و حزن، سستی و سرعت، صنعت و حرفت، خیر و شر، ظلمت و نور غرضیکہ دنیا و کائنات کا ہر مسئلہ ہر سوال اسی سے وضاحت پاتا ہے۔ نظریات کی جدلیات تو کبھی اختتام تک نہیں پہنچتی۔ فلسفہ کبھی تکمیل نہیں پاتا۔ مابعد الطبیعیات صرف تجریدی تصورات رہ جاتے ہیں۔ قرآن حقیقی خدا کا یقین نہ دلائے تو تمام عرصۂ حیات اس طرح احمقانہ لگتا ہے جیسے انسان کو اپنے سے کمتر زندگی کا دوران۔ کوئی انسان بہتر اور عجیب نہیں لگتا۔ بہتر اور عجیب بھی ایک قسم ہی ہو کے رہ جاتے ہیں۔ تمام اعلیٰ سوچ اور مقاصد خدا کے بغیر صحرا میں کھلے ہوئے شگوفوں کی طرح ہیں جن کو نہ کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے نہ کوئی ان کی تعریف کرنے والا۔ باہمی تعریف و توصیف کے گرداب میں الجھا ہوا انسان موت کے

وقت کس چیز کو اہمیت دے رہا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں، مگر میں سوچتا ہوں کہ مرنے کے بعد کی شہرت کسی مردے کو کیا فیض دے سکتی ہے۔ اللہ کے بغیر یہ زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ انجام اتنا یقینی ہے کہ انسان مجموعی ذہانت اور علمی استعداد سے بھی اسے بدل نہیں سکتا۔ زندگی جس پر ہر وقت موت کے سایوں کی لرزش ہے۔ اس عرصۂ حیات میں تمام برائی جارحانہ اور تمام اچھائی بزدلانہ طرزِ عمل ہے۔ اگرچہ انجام دونوں کا ایک ہی ہے، مگر شاید اچھائی زیادہ حسرت ناک انجام ہے۔

فہم قرآن کے لیے کیا درجۂ استعدادِ علم چاہیے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے، مگر اس کو پڑھنا کسی پر بھی بند نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن بتدریج اپنے قاری پر نزول فرماتا ہے۔ استعداد اور نیت کے مطابق۔ بڑے عالم کے اوصاف میں اہم صفت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو علمی صلاحیتوں سے پرکھتا ہے۔ وہ کسی کم ذہن سے بہتر اور بہتر سے کم تر رویوں کی توقع نہیں رکھتا۔ اللہ جو عالم الغیب و الشہادۃ ہے، لوگوں کے ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہے۔ تمام انسانوں کے درجاتِ علم و آگہی سے بخوبی آگاہ ہے۔ اگر قاری صرف صاحبِ قرأت ہے اور فہم و ادراک سے دور ہے تو کتاب اس کے لیے بھی فائدہ مند اور باعثِ تسکین ہے۔ اگر کوئی محض اپنے آپ کو عمل اور طرزِ حیات کی درستگی تک محدود رکھتا ہے تو قرآن اس کے لیے بھی لائحۂ عمل کا تعین کرتا ہے۔ اگر قرآن کو عمومی تعلیم کے نظریہ سے پڑھا جائے تو بھی یہ رشد و ہدایت کی سب سے بڑی کتاب ہے اور اگر صاحبانِ عقل و خرد اسے تحقیق و جستجو کے لیے مطالعہ کریں تو اللہ انہیں بھی خصوصی معانی سے نوازتا ہے۔ معدودے چند شاید اسے صرف اور صرف خدا کی محبت، آگہی اور شناخت کے لیے مطالعہ کرتے ہیں اور ہمہ تن اللہ کی رضا اور

قرب کی آرزو رکھتے ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اس کے لیے درجۂ الہام رکھتا ہے۔

قرآن جو فکر و خیال کے مراتب بلند کرتا ہے، جو اعلیٰ ترین تصورِ الٰہیات کو جلا بخشتا ہے، جو اول و آخر نہ صرف کتاب علم ہے، بلکہ اعلیٰ ترین پیغمبرانہ منصب پر فائز ہستی مبارک کو بھی افزائش علم کی دعا سکھانا نہیں بھولتا۔ (رب زدنی علماً) لازم ہے کہ اپنے قارئین میں انتخاب کرے، اس لیے اللہ کتاب حکیم میں اندھے اور بہرے اعتقاد کا سب سے زیادہ مخالف ہے۔ ”بدترین جانور انسان اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو عقل استعمال نہیں کرتے“۔ جو غور و فکر کو جان بوجھ کر معطل کر دیتے ہیں۔ جو اللہ کے کلام کو احمقانہ اور کورانہ تقلیدی انداز میں دیکھتے ہیں۔ یہ مسئلہ قریباً جملہ تعلیم یافتہ اصحاب کے ساتھ ہے۔ قرآن ان کی عقیدتوں کا مرکز ضرور ہے، مگر غور و فکر کا نہیں۔ مسلم سائنسدان، فلاسفر اور علمائے عصر حاضر اس خوف کا شکار ہیں کہ اگر ہم نے قرآن کو دوسرے علوم کے تنقیدی معیار سے پڑھا تو شاید قرآن اس پر پورا نہ اترے۔ یہ بھی عجب ذہنی عُجب ہے کہ وہ قرآن کو کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں۔ بہت سے دانشور ایسے ہیں جو اللہ اور اس کی کتاب کے مطالعہ کو اللہ پر احسان کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ خدایا قرآن کا ساتھ دے کر بڑی قربانی دے رہے ہیں۔ برصغیر کے دانشور علماء کا رویہ خود ساختہ شہیدوں کا سا ہے۔ قرآن کا مطالعہ انہیں انکسارِ علم سے آشنا نہیں کرتا، بلکہ مجددیت اور قطبیت کے دعاوی تک لے جاتا ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں میں شاید قرآن کا کوئی ایسا عالم ہو جس نے اپنی امارتِ اسلامیہ کا اظہار نہ کیا ہو اور اسلام اور قرآن فہمی اور تصوف کے نام پر تنظیمات نہ تخلیق کی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نیم علمیت کے زہر نے انہیں ڈس لیا اور وہ مذہبی خواب عظمت کے شکار ہو گئے۔

ایک نفسیاتی جائزہ یہ واضح کردے گا کہ یہ علماء نہ صرف اعتدال سے دور ہوگئے بلکہ اپنے متبعین میں بھی انہوں نے قرآن کی عظمت کی بجائے اپنے شخصی اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ جملہ تحریکات جو اسلام میں پچھلے سو برسوں میں اٹھیں، قرآن ہی کو اپنا اساسِ علم قرار دیتی ہیں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے ذاتی انقلاب کی غیر معقول خواہشات کے شکار ہوگئے، جس کا منبع ومحور وہ خود ہوں۔ اسلامی ملکوں کی حالت زار کی وجہ سے اب تصورِ مہدویت بھی اسلامی اور قرآنی افکار میں شامل ہوگیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ آنے والے علماء قرآن سے زیادہ زور مہدویت پر رکھیں گے کیونکہ یہ گردش اسلام میں سب سے زیادہ قابل فروخت نظریہ ہے۔

یہ حکمائے قرآن بہت سی ناقص تاویلات کے سہارے ایک ایسا اسلامی انقلاب لانے کی فکر میں ہوتے ہیں جس کا وقت نہیں آیا ہوتا۔ قرآن کا یہ استعمال انسانی استعمار کی بدترین مثال ہے۔ حیرت ہے کہ پہلے محترم اور مبارک مفسرین اور شارحین قرآن کو کبھی یہ خیال نہ آیا اور وہ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی پس منظر ہی میں اپنی تعلیمات کے فیوض بکھیر کر اللہ کے مہمان ہوگئے۔ قرآن اپنے احساس کمتری کے نظریات کے تحت نہیں پڑھا جاسکتا، نہ قرآن پہلے سے متعین نظریات ہی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ مکاتبِ اسلام میں تعصب اور فرقہ سازی اس وجہ غالب ہے کہ قرآن کی تفاسیر میں بھی اپنے نظریہ کو اجاگر کرنے میں وہ کسی پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔ غیر ایماندارانہ طریقہ تعلیم قرآن نے ان کے چند اندھے مقلد تو پیدا کرلیے مگر اعلیٰ ترین قرآنی تعلیمات کو ابہام کا شکار کردیا ہے۔ تمام انسان

ایک ذہنی استطاعت کے نہیں ہوتے اور یہ امرِ محال ہے کہ بہترین اذہان میں درجاتِ فہم و فراست نہ ہوں۔

بقول قرآن اللہ جس کے چاہتا ہے درجات بلند کرتا ہے اور ہر علم والے سے بالا کوئی علم والا ضرور موجود ہوتا ہے مگر مکاتبِ تعلیم قرآن اپنے ادنیٰ درجہ کے علماء کو بڑے بڑے خطابات دے کر اہلِ اسلام پر ناجائز ذہنی دباؤ ڈالنے کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ معمولی درجہ کے مترجمین کو نابغہ اور جینئس قرار دے کر عقیدت اور تقلید کے حصار قائم کر لیے ہیں۔ مقلد اور غیر مقلد دونوں تقلیدی ہیں۔ جو اعتراض دوسروں پر رکھا جاتا ہے‘ وہ بعینہٖ ان پر وارد ہوتا ہے۔ صرف حوالہ جات مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں اذہان ایک درجہ تعلیم اور فکر کے حامل نہ ہوں‘ وہاں تقلید سے کیسے جان بچ سکتی ہے۔ قرآن کے آج کے دانشور سب سے کم معتدل ہیں۔ اپنی زندگیوں میں ابنارمل رویہ رکھتے ہیں اور وہی غیر معقول رویہ اپنے مقلدین تک بھی پہنچاتے ہیں۔ قطع نظر قرآن کے جو اپنے طالب علموں کو پورا وقت اور عرصہ فکر دیتا ہے۔ یہ لوگ فتاویٰ میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔ برصغیر میں جذباتیت تو ہر ذرہ خاک میں سمائی ہوئی ہے مگر یہ جذباتیت قرآن کے معروضی اندازِ فکر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس عظیم کتاب کے عظیم ترین مصنف کو لوگ اپنے محدود ذہنی اور داخلی رویوں سے پرکھتے ہیں اور کتابِ کائنات کو چند مسائل ذات ولباس ومعاشرت تک محدود کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان مسائل کا ذکر قرآن نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ ان مسائل سے پہلوتہی کرنی

چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ اسلامی معاشرت میں ان کی ضرورت نہیں۔ مگر کیا ابتداء اور انتہا میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیا مسلمان ہونے کے ساتھ ان مسائل کی تعلیمات ضروری نہیں؟ کیا اول و آخر قرآنی تعلیمات صرف ان مسائل پر ختم ہوجاتی ہیں؟ نماز اور روزہ شروع کرنے والا مسلمان کیا لحہ سکرات تک انہی دو چیزوں پر قائم ہوگا اور اس کے علاوہ اسے کوئی قلب و ذہن کی طہارت اور ترقی نصیب نہ ہوگی؟ کیا تعلیماتِ دنیا کا بھی یہی معیار ہے؟ کیا پانچویں جماعت کا طالب علم ایم۔ اے تک ایک ہی مسئلہ کو بار بار پڑھتا رہا ہے؟ کیا پرائمری اور پوسٹ گریجویٹ کے علم میں کوئی فرق نہیں؟ دنیا کی کوئی درس گاہ اس قسم کی علمی پسماندگی کا شکار نہیں۔ قرآن کے طالب علم کیا کبھی مقصدِ تعلیم قرآن تک بھی پہنچتے ہیں! کیا خدا کی محبت، شناخت، اس کا قرب، اس کی بندگی شلوار کے پائینچوں کی بلندی ہی تک ہے؟ کیا اساتذہ علم قرآن اپنے تلامذہ میں احساسِ محبتِ خدا پیدا کرنے سے قاصر ہیں؟ کیا مسلمانوں میں وہ ظرف‘ وہ اخلاقی ترفع‘ وہ نورِ نوازشِ ربانی نظر آتا ہے جو بقول قرآن اللہ کے بندوں کے آگے آگے چلتا ہے؟ کیا زمانے کی بانجھ کوکھ سے کوئی جنیدؒ و بایزیدؒ، کوئی علی بن عثمانؒ یا عبدالقادرؒ کوئی معین الدینؒ اور فریدؒ پیدا ہوتے نظر آتے ہیں؟ کیا قرآنی تعلیمات ایسے ہی گروہ تخلیق کرتی ہیں جیسے ہمیں گلی کوچوں میں مختلف عماموں اور لبادوں اور پائینچوں میں نظر آتے ہیں؟

دنیا کے اعلیٰ نظام اپنے انتخاب میں بہت محتاط ہوتے ہیں اور اعلیٰ ترین امتحانات کے ذریعے بہترین اذہان چنے جاتے ہیں تاکہ اس چھوٹی سی دنیا کے چھوٹے سے نظام کو چلایا جاسکے۔ کیا خدائے بزرگ و برتر قرآنی نظام کو چلانے کے لیے ان لوگوں کو چنتا ہے جو آپ کو

اپنے اردگرد اسلام پہنے ہوئے نظر آتے ہیں؟ یہ آپ کو اس قابل بھی نظر نہیں آتے ہیں کہ آپ ان کو اپنے اذہان کے مناصب کے برابر سمجھیں‘ چہ جائیکہ انہیں رہبری کے عَلم عطا کر دیئے جائیں۔ خلافتِ ارضی کی عبا پہنائی جائے اور امامتِ دین و دنیا کا اہل سمجھا جائے۔

قرآن یقیناً گلہ گذار ہے۔ اس کا معیار وہ لوگ تھے جو صبح شام اللہ کی یاد میں گذارتے اور خشیت و محبت کے آنسوؤں سے غسل کرتے۔ اللہ کے رنگ میں سرتاپا رنگے ہوتے۔ دنیا و کائنات کی کسی شے کو باطل نہ سمجھتے۔ غور و فکر کی صلاحیتوں کو استعمال کرتے۔ تخلیقِ کائنات، سماوات، شب و روز کے اختلاف کے اصول ڈھونڈتے۔ تصرفِ ریاح، تسخیرِ سحاب کرتے۔ تحفۂ زمین کی نگہداشت کرتے۔ آیات و اعلام کے تجسس میں مصروف رہتے۔ شکر گذارِ حکمتِ کتاب ہوتے اور عبادت الٰہی میں مصروف حقِ بندگیٔ صاحبِ کائنات ادا کرتے۔ یہ ادیب، یہ سائنسدان، یہ مفکر، یہ متجسس روحیں جن کے علم کی پیاس سوائے قرآن کے کسی کتاب سے نہ بجھتی‘ جو اسے پڑھ کے کبھی سیر نہ ہوتے۔ اللہ کے لبادۂ علم میں سمٹے ہوتے۔ یہ مسلم و مومن اللہ کو اتنے عزیز ضرور ہوتے کہ مخفی علوم کی راہیں کشادہ کی جاتیں۔ یہ وہ عالمِ کتاب ہوتے جو آصف بن برخیا کی طرح فیوژن اور ڈی فیوژن پر قادر ہوتے۔ ان کی انگشت ہائے مبارک سے شمع فروزاں ہوتی، سنتِ پیغمبرؐ پر انگلیوں سے پانیوں کے چشمے پھوٹتے۔ ملائکہ اور جنات بنی آدم کی سیادت میں سر جھکاتے۔ تختِ سلیمانؑ کی طرح ہوائیں مسخر ہوتیں۔ ملائکہ سحاب کی اوٹ سے انہیں جھک کر سلام کرتے۔

یہ خواب و خیال کی باتیں نہیں۔ یہ مسلمانوں کی باتیں ہیں۔ اللہ کے بندوں کی باتیں

ہیں۔ کتاب کے وارثوں کی باتیں ہیں۔ خلیفۃ اللہ فی الارض کی باتیں ہیں۔ محمد رسول ﷺ کے ماننے والوں کی باتیں ہیں۔ قرآن کے طالب علموں کی باتیں ہیں۔ باقی تو وہ سب کچھ نہیں رہا۔ سیراب چشمے سراب صحرا میں بدل گئے۔ مقدس راستوں پر دھول اڑتی ہے۔ اجتماعیت تفرقہ سازی کی نذر ہوئی۔ امت مسلمہ پر ذھن غالب ہوا۔ اخلاق و ایمان قصۂ پارینہ ٹھہرا۔ متاع اہل ایمان تماشائے بازار ہوگئی۔ اللہ پر یقین ریش دراز کی لمبائی اور نیکلس کے ٹکّے تک محدود ہوا۔ مگر کیا کچھ رجعت ممکن ہے۔

سب کچھ گنوانے کے باوجود ایک چیز تو محفوظ ہے۔ ایک خزانہ تو ہے جسے کوئی نقب نہیں لگا سکا۔ ایک کتاب جو آج تک کبھی بھی آلودہ تحریفِ زمانہ نہیں ہوئی۔ اللہ کا کلام، اللہ کی دلیلِ غالب، سلطانِ نصیر، اساس علم و حکمت، شرفِ مسلم و اسلام، فلسفۂ ذات و کائنات، تحریکِ فکر ترجیحات، کلیدِ محبتِ خدا و رسولؐ، طلسم کشائے چیستان، لذت زبان، انکسارِ خیال، رفعتِ فکر، انتہائے تخلیقِ انسان۔ جب آپ اُس کی طرف پلٹو گے فاصلے سکڑ جائیں گے، حوادث کے رخ پلٹ جائیں گے۔ آسمانوں کے بالا خانوں سے رحمت کی پھوار پڑے گی۔ آفتاب رخِ محروم کی تاریکیاں نوچ لے گا۔ گردشِ افلاک منفعل اور زمین و آسمان پابند خلیفۃ اللہ فی الارض............

وما علینا الا البلاغ